اندازِ بیاں

ڈاکٹر مبارک علی

اندازِ بیاں

ڈاکٹر مبارک علی سے گفتگو

(بلند اقبال کے لیے گئے راول ٹی وی کے انٹرویو)

ڈاکٹر مبارک علی

بدلتی دنیا پبلی کیشنز

مکان نمبر 133، گلی نمبر 8، سیکٹر F-11/1 اسلام آباد
0333-5577993

جملہ حقوق محفوظ ہیں

کتاب کا نام	:	اندازِ بیاں
مصنف	:	ڈاکٹر مبارک علی
اہتمام	:	ایوب ملک
پبلشر	:	بدلتی دنیا پبلی کیشنز، اسلام آباد
کمپوزنگ	:	میٹرکس کمپوزر 03005211201
موسمِ اشاعت	:	جولائی 2017ء
مطبع	:	محمود برادرز پرنٹرز، گوالمنڈی، راولپنڈی

Rs300/-
$ 15/-

ISBN: 978-969-7753-10-9

خوبصورت کتب کی اشاعت کے لیے ہم سے رابطہ کیجیے 0333-5577993

ادارہ ایسی کتب کی اشاعت کرتا ہے جو تحقیق کے لحاظ سے اعلیٰ معیار کی ہوں۔ اشاعتِ کتب کا مقصد کسی کی دل آزاری یا ضرر رسانی نہیں بلکہ اشاعتی دنیا میں ایک نئی جدت پیدا کرنا ہے۔ جب کوئی مصنف کتاب لکھتا ہے اُس میں اُس کی اپنی تحقیق اور خیالات شامل ہوتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ اور ہمارا ادارہ مصنف کے خیالات اور تحقیق سے متفق ہوں۔ انسانی طاقت اور بساط کے مطابق کمپوزنگ، طباعت، تصحیح اور جلد سازی میں پوری احتیاط برتی گئی ہے۔ بشری تقاضوں اگر کوئی غلطی رہ گئی ہو تو ازراہِ کرم مطلع فرمائیں۔ اگلے ایڈیشن میں ازالہ کر دیا جائے گا۔ (ادارہ)

بدلتی دنیا پبلی کیشنز

مکان نمبر 133، گلی نمبر 8، سیکٹر F-11/1 اسلام آباد
0333-5577993

فہرست

	پیش لفظ	06
-1	پاکستان بمقابلہ ہندوستان	07
-2	فرقہ واریت اور پاکستان	19
-3	تاریخ وانقلاب	36
-4	عقیدہ اور علم۔صحت اور نفرت کے درمیان	52
-5	کیا جنگ ایک جرم ہے؟	65
-6	ٹیکنالوجی	81
-7	قدیم تہذیبیں اور ان کی دریافت (حصہ اوّل)	93
-8	قدیم تہذیبیں اور ان کی دریافت (حصہ اوّل)	103

☆☆☆

پیش لفظ

قدیم یونان میں دستور تھا کہ دانشوروں کی جو محفلیں ہوا کرتیں تھیں انہیں سمپوزیم کہا جاتا تھا۔ اگرچہ یہ پینے پلانے اور کھانے کی مجلسیں ہوتیں تھیں مگر ان میں شریک ہونے والے ایک دوسرے سے فلسفیانہ موضوع پر مکالمہ کیا کرتے تھے۔ سوال کیا جاتا تھا اور پھر اُس کا جواب دیا جاتا تھا۔ ان مکالموں میں بے حد سنجیدہ فلسفیانہ رموز پر بحث و مباحثہ ہوتا تھا۔ افلاطون کی کتاب ریپبلک ڈائیلوگ کی شکل میں ہے۔ یہی انداز ہندوستان میں اُپن شد لکھنے والوں نے اختیار کیا۔ شائد موجودہ دور کے انٹرویوز اسی دور کی ایک کڑی ہے۔ اس مختصر سی کتاب میں بلند اقبال کو دیئے گئے انٹرویوز شامل ہیں جو راول ٹی وی کے تحت ریکارڈ کئے گئے ہیں۔ کوشش کی گئی ہے کہ موجودہ دور کے اہم مسائل پر گفتگو کر کے انہیں سمجھا جائے۔ اس سلسلے میں محمد شعیب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ جنہوں نے اس کتاب کی تیاری میں میری مدد کی اور بدلتی دنیا کے ایوب ملک اور محمود اظہر بھی قابل تحسین ہیں کہ جو محنت سے معیاری کتابیں شائع کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر مبارک علی

8 ستمبر ۲۰۱۷ء

1- پاکستان بمقابلہ ہندوستان

بلند اقبال

اس سے پہلے کہ میں پاکستان اور ہندوستان کے بارے میں سوالات کروں۔ میں اس کی وضاحت چاہوں گا کہ کچھ قومیں بڑی خوش نصیب اور خوشحال ہیں۔ امن و امان اور سکون کے ساتھ رہ رہی ہیں۔ لوگوں کی اوسط عمر زیادہ ہے۔ سیاسی استحکام ہے اور ثقافتی لحاظ سے تمام سہولتیں میسر ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ ان کے مقابلے میں کچھ قومیں غربت و افلاس میں مبتلا ہیں۔ نوجوان تعلیم سے محروم ہیں پینے کو صاف پانی میسر نہیں بچے بھوک اور فاقے سے مر جاتے ہیں۔ ریاست کا جبر اور تشدد لوگوں کی زندگی کو اجیرن بنا دیتا ہے۔ آج اس موضوع پر میں چاہوں گا کہ ڈاکٹر مبارک علی سے گفتگو کروں اور سوالات کا جواب چاہوں۔ لیکن اس سے پہلے میں ہندوستان اور پاکستان کے بارے میں کچھ سوالات کا جواب چاہوں گا مثلاً کیا وجہ ہے کہ پاکستان میں معاشی دہشت گرد پیدا ہو رہے ہیں جبکہ ہندوستان میں جمہوریت اور صنعتی ترقی آگ کی جانب رواں دواں ہے۔

مبارک علی

اگرچہ پاکستان اور ہندوستان ایک ساتھ آزاد ہوئے لیکن آزادی کے بعد دونوں ملکوں نے جدا جدا راہیں اختیار کیں اس کی وجہ یہ ہے کہ کانگرس پارٹی 1885ء میں قائم ہوئی تھی اور اس نے آزادی کی جدوجہد میں سیاسی تجربات کئے تھے۔ مزید براں کانگرس قوم

پرست پارٹی ہونے کی وجہ سے سیکولر تھی اور اس میں ہندو مسلمان عیسائی اور دوسرے مذاہب کے لوگ بھی شامل تھے اس کے راہنماؤں کا تعلق متوسط طبقے سے تھا جس کی اکثریت وکیلوں کی تھی اور اس لیے آزادی کے بعد ان کے پاس ریاست کے ہر شعبے کے ماہرین موجود تھے۔ جواہر لال نہرو نے پہلے وزیراعظم ہونے کی حیثیت سے سماج کی تشکیل کے لیے خاکہ پیش کیا جسے نہرو کا وژن کہا جاتا ہے اس کی بنیاد یہ تھی کہ ہندوستانیوں کو غیر ملکی اشیاء کی بجائے اپنی بنائی ہوئی چیزوں کا استعمال کرنا چاہیے۔ اس نے ہندوستان کی راہ کو متعین کر دیا اور اولین دور میں اس نے سیاسی استحکام بھی حاصل کر لیا۔ اگرچہ ہندوستان کے تمام مسائل حل تو نہیں ہوئے غربت اور افلاس کا خاتمہ نہیں ہوا اور آگے چل کر جب ہندوستانی ریاست نے سرمایہ دارانہ نظام کی بنیاد پر معاشی ترقی تو ضرور کی مگر ہندوستان آج بھی امیر و غریب کے طبقوں میں بٹا ہوا ہے۔

مسلم لیگ جس نے پاکستان بنانے میں حصہ لیا ہے 1906ء میں قائم ہوئی تھی اور صرف مسلمان اس کے رکن بن سکتے تھے سیاست میں بھی اس کے تجربات بہت کم تھے اور نہ ہی ہر شعبے کے ماہرین اس کو میسر تھے۔ اس کے علاوہ پاکستانی ریاست ہندوستان کے مقابلے میں بالکل نئی تھی۔

ہندوستانی ریاست کی تاریخی بنیادیں ہیں۔ قدیم دور سے لیکر برطانوی دور تک یہ ریاست اپنا وجود برقرار رکھتی رہی ہے۔ لہٰذا آزادی کے بعد اس نے تاریخی تسلسل کو جاری رکھا جبکہ پاکستانی ریاست کو تشکیل نو کی ضرورت تھی۔ اس کے ادارے مضبوط بنیادوں پر قائم نہیں تھے۔ مسلم لیگ کے پاس ماہرین کی بھی کمی تھی اس لیے پاکستان کے راہنما اس کی رہ کو متعین نہیں کر سکے۔

میں پاکستان کی تاریخ کو دو ادوار میں تقسیم کرتا ہوں۔ پہلا دور 1947ء سے شروع ہو کر 1970ء تک آتا ہے۔ اگرچہ 1956 میں دستور تو بنا دیا گیا تھا۔ مگر اس کی بنیاد پر کوئی الیکشنز نہیں ہوئے تھے۔ اسی دور میں ایوب خان اور یحییٰ خان کا مارشل لاء لگا اور

جمہوریت کے راستے بند ہوئے 1965ء کی جنگ میں ہندوستان سے تعلقات بگڑے اور یحییٰ خان کی فوجی آمریت نے بنگلہ دیش بنایا۔ اس نے ایک عہد کا خاتمہ کر دیا اور اس کے بعد ایک نیا پاکستان وجود میں آیا۔

پیپلز پارٹی کی حکومت کے دوران جب نئی ریاست کی بنیاد ڈالی گئی تو ریاست کو مذہبی معاملات میں غیر جانبدار ہونے کے بجائے مذہبی بنا دیا اور یوں مذہب اور سیاست کا ملاپ ہوگیا۔ اس نے غیر مذہبی اقلیتوں کو قومی دھارے سے جدا کر دیا۔ آگے چل کر ضیاء الحق کی فوجی آمریت میں پاکستان کی صورتحال اس وقت مزید بدلی جب افغانستان کے مسئلے پر پاکستان نے اس میں عملی حصہ لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستان میں افغان مہاجرین کی آمد ہوئی۔ روسیوں کی مخالفت میں طالبان کو منظّم کرایا گیا اور اس جنگ کی وجہ سے بے شمار اسلحہ پاکستان آیا اور مختلف مسلح جماعتیں سیاست میں متحرک ہوگئیں ان کے مقابلے میں ریاستی ادارے کمزور ہوتے چلے گئے اور سوسائٹی میں دہشت گرد جماعتیں طاقتور ہوتیں چلی گئیں۔ خودکش حملے، مسلح جتھوں، قتل عام اور عدم تحفظ کا ہونا ان سب نے مل کر پاکستانی ریاست وسماج کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

بلند اقبال

ہندوستان میں ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے ہاں اوّلین دور میں جو سوشلسٹ پالیسی تھی اسے باآسانی تبدیلی کر کے سرمایہ دارانہ نظام میں ڈھال لیا۔ ذرا اس پر روشنی ڈالیئے۔

مبارک علی

جیسا میں نے پہلے ذکر کیا کہ آزادی کے بعد ہندوستان کی معاشی اور سیاسی تعمیر کے لیے نہرو نے ایک وژن دیا تھا۔ پہلی بات تو یہ کہ 1951ء میں ہندوستان نے اپنا دستور بنا کر ریاستی اداروں کو مستحکم کر دیا اور جمہوری روایات کی داغ بیل ڈالی۔ دوسرے نہرو کا خیال یہ تھا کہ روس کی طرح منصوبہ بندی کے تحت صنعتی عمل کو جاری کیا جائے تا کہ ہندوستان

معاشی طور پر مستحکم ہو۔ جمہوری راویات اس وقت مضبوط ہوئیں۔ جب 1951ء میں جاگیرداری کا خاتمہ کیا گیا اور ایک ایک کر کے نوابوں اور راجاؤں کی ریاستوں کا خاتمہ بھی کیا گیا۔ ہندوستان کو ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ برطانوی دورِ حکومت میں یہاں قومی بورژوا وجود میں آ چکا تھا اور ٹاٹا اور برلا نے صنعتی میدان میں کافی ترقی کر لی تھی۔ اس لیے آزادی کے بعد ہندوستان کو صنعت ورثے میں ملی۔

اس صنعتی ترقی کا نتیجہ یہ ہوا کہ سرمایہ دار طبقے کو سوشلسٹ معیشت کی جگہ سرمایہ دارانہ نظام اور آزاد منڈی کی ضرورت تھی تاکہ وہ اپنے مفادات کی تکمیل کر سکیں۔ چنانچہ اس کام کو من موہن سنگھ جو وزیرِ خزانہ تھے، پورا کیا۔ اب اس کے منفی اور مثبت دونوں اثرات ہم ہندوستان میں دیکھتے ہیں۔

بلند اقبال

کیا سوشل ازم سے سرمایہ دارانہ نظام کی طرف آنا یہ روس کے زوال کے بعد ہوا یا اس سے پہلے بھی سوشل ازم کے بارے میں مایوس ہونے لگی تھی؟

مبارک علی

جی بالکل ہندوستان کی طرح دنیا کے دوسرے ملکوں میں جو اب تک سوشلسٹ نظام کو آئیڈیل تصور کرتے تھے عالمی حالات نے انہیں مجبور کرنا شروع کر دیا تھا کہ وہ اس سے نکل کر سرمایہ دارانہ نظام میں شامل ہوں۔ مارگریٹ تھیچر اور ایگن کے دور میں آزاد مارکیٹ کے خیال کو مقبول بنایا جا رہا تھا۔ ہندوستان میں اس منصوبے کو من موہن سنگھ نے پورا کیا۔ چائنہ بھی اسی نظام کے دھارے میں شامل ہوا اور اس وقت ریاست اور آزاد منڈی کے درمیان ایک کشمکش ہے اس میں ریاست اپنے اختیارات کھو رہی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام غریبوں کو بے بس مجبور اور لاچار بنا رہا ہے۔ جبکہ کارپوریٹ طبقہ دولت سمیٹ رہا ہے۔

بلند اقبال

کیا پاکستان ایک ناکام ریاست ہے؟

مبارک علی

حال ہی میں دو امریکی پروفیسروں نے ایک کتاب لکھی ہے۔ جس کا موضوع ہے Why Nations Failed یعنی قومیں کیوں ناکام ہوتیں ہیں۔ اس کتاب میں انہوں نے تفصیل کے ساتھ ایشیاء، افریقہ اور یورپ کی تاریخ کا جائزہ لیا ہے۔ جس کے بعد انہوں نے دو باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ قوموں کی ناکامی کی وجہ بتاتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ جب کسی بھی ریاست میں استحصالی ادارے مضبوط ہوں اور وہ لوگوں کی جیبوں سے ٹیکسوں کی مد میں زبردستی پیسہ حاصل کریں تو اس کے نتیجے میں عام لوگوں کی معاشی حالت ابتر ہوتی چلی جاتی ہے۔ اور وہ دولت جو ریاست عوام سے زبردستی حاصل کرتی ہے اسے وہ اپنی عیاشیوں اور مراعات پر استعمال کرتی ہے جس کے نتیجے میں معاشرہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو کر ختم ہو جاتا ہے۔

وہ قومیں جو ترقی کرتی ہیں ان کے ہاں عوام کو ریاستی اداروں میں شریک کیا جاتا ہے۔ ان سے رائے لی جاتی ہے۔ مشورہ کیا جاتا ہے اور جس کی وجہ سے جمہوری روایات مضبوط ہوتیں ہیں۔ اگر اس تناظر میں ہم پاکستان کی ریاست کو دیکھیں تو ہم پر صاف واضع ہو جائے گا کہ پاکستانی ریاست لوگوں سے زبردستی ٹیکسوں کے ذریعے پیسہ وصول کرتی ہے اور انہیں ریاستی اداروں میں شریک نہ کر کے ان کی توانائی سے محروم رہتی ہے۔ یہی وہ وجہ ہے کہ پاکستان میں حکمران طبقوں اور عوام میں بہت دوری ہے۔ اور ریاست عوام کی نظروں میں محافظ ہونے کی بجائے ان کی دشمن ہے۔

ایک اور رویہ جو قوموں کے زوال میں ہم دیکھتے ہیں وہ یہ ہے کہ جب ریاست اپنے عوام کو تحفظ نہ دے، روزگار نہ دے، تعلیم اور صحت نہ دے یہاں تک کہ پینے کا صاف

پانی بھی نہ دے تو پھر افراد کی توجہ قوم کی بجائے اپنی ذات پر ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی ذات کی حفاظت کے لیے قوم کے مفاد کو قربان کر دیتے ہیں۔ یہی وہ صورتحال ہے کہ جس سے پاکستانی لوگ دو چار ہیں۔

بلند اقبال

یہاں پر میں یہ سوال کرنا چاہوں گا کہ کیا اس صورتحال میں جیسا کہ ہماری مذہبی جماعتیں دعوی کرتیں ہیں کہ شرعی قوانین کے نفاذ کے ذریعے ہمارے تمام مسائل حل ہو سکتے ہیں تو یہ کہاں تک درست ہیں؟

مبارک علی

آپ کا یہ سوال کہ شرعی قوانین کے نفاذ کے بعد معاشرے کے تمام مسائل حل ہو جائیں گے۔ درحقیقت اگر اس کو تاریخ کے تناظر میں دیکھا جائے تو ہم دیکھے گے کہ شرعی قوانین یا فقے کے چار سنی مکاتب اپنے وقت کے حالات اور تقاضوں کے تحت وجود میں آئے۔شیعہ مسلک میں فقہ جعفریہ (شیعہ مسلک) کے ماننے والوں کے مسائل کے حل کے لیے وجود میں آیا تھا لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ شرعی قوانین کی نوعیت ہر فقہ کے نزدیک جدا جدا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اسلامی حکومتوں میں شرعی قوانین کو کبھی بھی مکمل طور پر نافذ نہیں کیا گیا بلکہ ان کی جگہ اسلامی حکومتوں نے اپنے مفادات کے تحت نئے قوانین اور ضوابط بنائے۔

لہٰذا کسی بھی معاشرے کے لیے اس کے سیاسی، سماجی اور معاشی استحکام کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اخلاقی اقدار پر عمل کرے۔ اخلاقی اقدار کا تعلق مذہب سے نہیں ہوتا ہے بلکہ یہ معاشرے کی اپنی ضرورتوں اور ضھم سے پیدا ہوتیں ہیں۔مثلاً ایمانداری، دیانت، سچ بولنا، ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی کا سلوک کرنا، اگر یہ اخلاقی اقدار ٹوٹ جائیں اور معاشرے میں ان کی کوئی قدر نہ رہے تو اس صورت میں ہر شخص آزاد ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے مفاد کے لیے لوگوں کو دھوکا دے جھوٹ بولے، اشیاء میں ملاوٹیں کرے۔ بدعنوانیوں میں

ملوث ہو، کیونکہ اخلاقی اقدار کی غیر موجودگی میں اس کو روکنے والا کوئی نہیں۔ اس وقت پاکستان اس صورتحال سے دو چار ہے۔ یہاں طالب علم نقل کرنے میں آزاد ہیں، دوکاندار اشیاء میں ملاوٹ کرنے میں آزاد ہیں۔ وکیل ججوں کو مارنے میں آزاد ہیں اور ڈاکٹر مریضوں کا استحصال کرنے میں آزاد ہیں۔ ان برائیوں کے علاج کے لیے اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ ان کا حل سخت سزاؤں میں ہے۔ شرعی قوانین کا مطلب ہی سخت سزاؤں سے لیا جاتا ہے۔ یعنی مجرموں کو چوراہوں میں الٹا لٹکایا جائے یا پھانسی دی جائے۔ سرِ عام کوڑے مارے جائیں۔ ہاتھ کاٹے جائیں۔ لیکن تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ سخت سزاؤں کے ذریعے معاشرے سے کبھی بھی جرائم کا خاتمہ نہیں ہوا۔ یونان میں چھٹی قبل مسیح میں ڈریکو (DRACO) نامی شخص نے سخت قوانین بنائے جن میں معمولی جرم کی سزا بھی موت تھی لیکن یہ جرائم کا خاتمہ نہ کر سکے۔ یہی صورتحال عہد وسطیٰ کے یورپ کی تھی۔ جہاں روٹی کا ایک ٹکڑا چرانے پر موت کی سزا دی جاتی تھی لیکن یہ حالات اس وقت بدلے جب ان ملکوں میں خوشحالی آئی جمہوری روایات آئیں اور سوسائٹی کے تحفظ کے لیے اخلاقی اقدار کو اختیار کیا گیا۔

موجودہ دور میں پاکستانی ریاست کے پاس اخلاقی اقدار ہیں نہ حکمران طبقوں کے پاس اور نہ عوام کے پاس جب تک معاشرے کی ذہنی ترقی نہیں ہوگی اس وقت تک شرعی یا ریاستی قوانین معاشرے کو تبدیل نہیں کر سکیں گے۔

بلند اقبال

آپ ان ملکوں کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ جہاں شرعی نظام قائم ہے جیسے سعودی عربیہ یا ایران؟

مبارک علی

اگر آپ سعودی عرب کے شرعی نظام کو دیکھیں تو یہ وہ نظام ہے جو شاہی خاندان

اور ان کے افراد کا تحفظ کرتا ہے۔ شریعت کے تحت بادشاہت کے نظام پر اعتراض کیا جاسکتا ہے اور یہ بھی کہ اقرباء پروری کے تحت شاہی خاندان کے افراد تمام بڑے عہدوں پر فائز ہیں اور یہ بھی کہ پٹرول ڈالرز کو شاہی خاندان کے افراد اپنی عیاشیوں پر صرف کرتے ہیں، انکے شرعی نظام کی بنیاد ان کی دولت پر ہے جس دن یہ دولت ختم ہوگئی انکا یہ شرعی نظام بھی بکھر جائے گا۔ یہ شرعی نظام کلچر پیدا نہیں کر سکا۔ ہمیں وہاں کے کسی بھی ادیب، شاعر، آرٹسٹ اور فلم بنانے والوں کا پتہ نہیں چلتا، وہ ایک ایسی سوسائٹی ہے جہاں حکومت پر تنقید کرنا یا سوال کرنا سب سے بڑی بغاوت ہے۔ شرعی نظام کا نفاذ مجرموں کی گردن اُڑانے سے کیا جاتا ہے۔ ایک ایسی قوم جو عالمی تہذہب میں کوئی اضافہ نہ کرے وہ دنیا کی نظروں میں قابل احترام نہیں ہوتی ہے۔

اب رہی ایران کی بات تو ایران ہزار ہا سال کی تہذیب کا وارث ہے اس نے اعلیٰ معیار کا ادب شاعری آرٹ، موسیقی اور فلموں کو پیدا کیا ہے لیکن اسلامی انقلاب کے بعد ایران بھی مذہبی پابندیوں کا شکار ہو کر اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو کھو رہا ہے۔ ان حالات میں بھی دنیا کی اہم کتابوں کے فارسی ترجمے ہو رہے ہیں اور ایرانی دانشور اپنا کردار ادا کرنے میں مصروف ہیں۔

بلند اقبال

ڈاکٹر صاحب کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ پاکستان میں ایسے نئے ادارے بننے کی اُمید ہے کہ جو بگڑے ہوئے حالات کو بہتر بنا سکیں؟

مبارک علی

آپ نے جو سوال کیا ہے کہ کیا پاکستان میں کوئی نئے ادارے بننے کی اُمید ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہم تو ان اداروں کو بھی برباد کر رہے ہیں جو پہلے سے موجود ہیں جو خاص طور سے وہ ادارے کہ جن کا تعلق عوام کی فلاح و بہبود سے تھا۔ مثلاً تعلیم اور صحت کو ہی

لے لیجئے اب ریاست نے انہیں تجارتی ہاتھوں میں دے دیا ہے۔ جو عوام کو لوٹنے میں مصروف ہیں۔ پبلک ٹرانسپورٹ کا تقریباً خاتمہ ہو چکا ہے۔ PIA کا ادارہ جو کبھی اپنی لاجواب کارکردگی کی وجہ سے مشہور تھا اب اپنی نااہلی کی وجہ سے جانا پہچانا جاتا ہے۔ لہٰذا چاہے عدالتیں ہوں یا نوکر شاہی یہ سب ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہیں۔ اب لے دے کر فوج کا یہ دعویٰ رہ جاتا ہے کہ وہ سب سے زیادہ منظّم ادارہ ہے۔ اور اسی بنیاد پر وہ یہ حق سمجھتی ہے کہ ملکی سیاست میں دخل دے کر اُسے بہتر بنائے۔

معاشرے میں تبدیلی لانے کے لیے ایسی تنظیمیں اور ادارے ہوتے ہیں جو اپنے کردار سے فرسودہ روایات اور اداروں کو بدل کر ان کی جگہ متبادل ادارے قائم کرتے ہیں۔ تبدیلی کے ان ایجنٹوں میں سیاسی جماعتیں، مزدوروں کی ٹریڈ یونینز، طالب علموں، صحافیوں اور دانشوروں کی جماعتیں قابل ذکر ہوتیں ہیں۔ مگر پاکستان میں اب یہ سب بدعنوانیوں میں ملوث ہو کر اپنے کردار کو کھو چکے ہیں۔ اس وقت پاکستان میں دائیں اور بائیں بازو کے نظریات کا فرق بھی بہت کم رہ گیا ہے۔ ان حالات میں ایسا نظر آتا ہے کہ شاید معاشرہ اس پسماندگی کو طویل عرصے تک برداشت کرے گا اور کسی تبدیلی کے حق میں نہیں ہوگا۔

بلند اقبال

ڈاکٹر صاحب اگرچہ آپ کی ان باتوں سے مایوسی ظاہر ہوتی ہے لیکن ہمیں جو کچھ دنیا میں ہو رہا ہے اس سے بھی کچھ سیکھنا چاہیے مثلاً یورپ کے ممالک میں جو کبھی مسلسل جنگوں میں مصروف رہتے تھے۔ اب ایک ہو گئے ہیں تو کیا ہمارے خطے میں ایسا ہونا ممکن ہے؟

مبارک علی

جی بالکل ممکن ہے کیونکہ برصغیر یا ساؤتھ ایشیاء کے ممالک میں یہ روایات بڑی پرانی رہی ہیں کہ یہاں مختلف مذاہب عقائد اور رنگ و نسل کے لوگ آپس میں مل جل کر

رہے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ یہاں بھی جنگیں ہوتیں رہیں ہیں لیکن جب بھی بڑی ایمپائرز بنی ہیں تو انہوں نے امن وامان قائم کر کے مذہبی رواداری کو فروغ دیا جیسے کہ قدیم ہندوستان میں موریا ایمپائر اور نمید واسطی میں مغل ایمپائر یہاں برطانوی حکومت کے دوران مذہبی فرقہ وارانہ فسادات ہونے شروع ہوئے جنہوں نے ماحول کو نفرت انگیز بنایا۔لیکن آزادی کے بعد جن ملکوں نے تاریخ سے سبق سیکھتے ہوئے حالات کر بہتر بنایا ان میں سری لنکا شامل ہے۔اس وقت وہاں سو فیصد تعلیم ہے، ہندو، مسلمان، عیسائی اور بدھ مت مذہب کے ماننے والے آپس میں مل جل کر رہتے ہیں۔ضرورت اس بات کی ہے کہ اس ماڈل کو ہندوستان پاکستان اور بنگلہ دیش اختیار کرے۔

برصغیر کے یہ تینوں ممالک 1947ء سے پہلے ایک ہی تھے لہٰذا اس مشترک تاریخ کی بنیاد پر اپنے اقتدار اعلی کو برقرار رکھتے ہوئے متحد ہونا چاہیے اور ایک دوسرے سے سیکھنا چاہیے۔اس کے لیے ضروری ہے کہ تجارتی معاہدے ہوں، طالب علموں اور دانشوروں کے درمیان باہمی تبادلے ہوں۔لوگوں کو آنے جانے کی سہولتیں ہوں تو اس صورت میں آپس کی غلط فہمیاں بھی دور ہونگی اور روابط بھی بڑھیں گے۔کیونکہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ جنگوں کے ذریعے مسائل حل نہیں ہوئے بلکہ انہوں نے حالات کو اور زیادہ بگاڑا لہٰذا اب ہمیں اس عالمی صورتحال میں اپنے خطے و متحد کر کے حالات سے مقابلہ کرنے کی ضرورت ہے۔

بلند اقبال

ڈاکٹر صاحب کیا بحیثیت قوم جو ہم میں خود پسندی کا جذبہ ہے یہ ہماری اور معاشرے کی ترقی میں رکاوٹ ہے؟

مبارک علی

اپنی ذات سے دلچسپی اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب ریاست اپنی ذمہ داریوں کو چھوڑ دیتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں برادریوں اور قبائل کی شناخت ابھر رہی ہے۔

اوراب تقریباً ہر فرد اپنے نام کے ساتھ اپنی برادری یا قبیلے کے نام کا اضافہ کر کے خود کو ممتاز کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اب تعلیمی ادارے ہوں یا ہسپتال اور فلاحی اداروں میں بھی برادریوں کا عمل دخل بڑھ گیا ہے۔ لہٰذا لوگ اب قوم کے بجائے اپنی ذات یا برادری کی بنیاد پر سوچتے ہیں۔ انتخابات میں بھی سیاسی پارٹیاں برادریوں کی حمایت حاصل کرنے کے لیے ان کی حمایت کرتیں ہیں لہٰذا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اب قوم کے بجائے لوگ اپنی برادری اور ذات کے دائرے میں رہتے ہیں۔

بلند اقبال

کیا پاکستان کے ان مسائل کا یہ حل تو نہیں ہے کہ یہ ٹوٹ جائے اور مختلف حصوں میں بٹ جائے جس کی وجہ سے شاید علاقائی زبانیں اور کلچر محفوظ ہو جائیں گے؟

مبارک علی

نہیں میرا ایسا خیال نہیں ہے۔ کیونکہ مسائل کا حل اس میں نہیں کہ ملک کو توڑ کر اس کو کئی حصوں میں تقسیم کر دیا جائے اس کی سب سے بڑی مثال ہمارے سامنے 1947ء کی تقسیم ہے جس نے برصغیر کو دو ملکوں کی شکل میں تقسیم کر دیا تھا لیکن اس تقسیم نے مسائل کو حل کرنے کی بجائے نئے مسائل کو پیدا کیا۔ ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات اس کی ایک مثال ہیں۔ اس کے بعد بنگلہ دیش پاکستان سے علیحدہ ہوا لیکن اس علیحدگی نے اس کے بھی مسائل کو حل نہیں کیا۔ دنیا میں اور بھی کئی ملک ٹوٹے جن میں سے ایک یوگوسلاویہ کی مثال ہے اس کے ٹوٹنے کے نتیجے میں فسادات ہوئے، قتل عام ہوا اور صدیوں کے لیے لوگوں کے رشتے ناطے ختم ہوئے لہٰذا فرض کریں کہ پاکستان ٹوٹتا ہے اور اس کے نتیجے میں نئے ملک بنتے ہیں تو اب ان کے نئے حکمران ہوں گے نئی فوج ہوگی اور نئے ریاستی ادارے ہوں گے جو لوگوں کا استحصال کریں گے۔ جہاں تک زبان اور تاریخ کے تحفظ کا تعلق ہے تو یہ آج بھی صوبائی حکومتوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ کلچر کی ترقی میں اپنا کردار ادا کریں۔

اس لیے میرا یہ خیال ہے کہ پاکستان کے مسائل کا حل اس کو توڑنے میں نہیں بلکہ اس کے جمہوری اداروں کو مستحکم کرنے، ہمسائیوں سے بہتر تعلقات رکھنے اور اسلحہ کے بجائے عوام کی تعلیم اور صحت پر خرچ کرنے پر ہے۔ ایک مرتبہ ہندوستان کے وزیر دفاع جون فرینڈس نے کہا تھا کہ دفاع پر اتنا خرچ مت کرو کہ دفاع کرنے کے لیے کچھ نہ بچے۔

بلند اقبال

ڈاکٹر صاحب آپ کا بہت بہت شکریہ لیکن ہم پھر بھی آپ کو تکلیف دیتے رہیں گے۔

☆......☆......☆

2- فرقہ واریت اور پاکستان

بلند اقبال

فرقہ واریت اسلامی معاشرے کا ایک اہم مسئلہ رہا ہے۔ اس لیے آج ہم اس موضوع پر بات کریں گے کہ فرقے کیونکر پیدا ہوتے ہیں اور کس طرح یہ سوسائٹی میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ پاکستان کی سرزمین فرقہ وارانہ فسادات کے لیے زرخیر ہے۔ کیا وجہ ہے کہ یہاں سعودی عربیہ اور ایران کی جنگ پاکستان میں شیعہ اور سنی فرقوں کی شکل میں لڑی جاتی ہے۔ کیا وجہ ہے کہ روس اور امریکہ کے درمیان ہونے والی جنگ بھی پاکستان کی سرزمین پر ہوتی ہے۔ کیا وجہ ہے کہ یہ فرقہ وارانہ جھگڑے غیر ملکی اثرات کی وجہ سے نا تو بنگلہ دیش میں ہوتے ہیں نہ ملائیشیاء اور انڈونیشیاء میں اور کیا وجہ ہے کہ یہاں وہابی، بریلوی، اہل حدیث اور فقہ جعفریہ کے ماننے والے ایک دوسرے سے دست وگریبان ہوتے ہیں۔ یہ اور ایسے دیگر سوالات جن کا جواب آج ہم ڈاکٹر مبارک علی سے جاننے کی کوشش کریں گے؟

مبارک علی

جہاں تک فرقہ واریت کا تعلق ہے تو یہ اسلامی سوسائٹی ہی کا حصہ نہیں ہے بلکہ دنیا کے تمام بڑے مذاہب فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ اس لیے میں پہلے اس کی وضاحت کروں گا کہ مذاہب میں فرقوں کی ابتداء کیسے ہوئی ہے اور کیونکر یہ فرقے مذہب کو کئی حصوں

میں تقسیم کرتے ہیں۔ مثلاً اگر مذاہب کی تاریخ کو دیکھا جائے تو یہ سب اپنے ابتدائی دور میں آسان اور سادہ تعلیمات رکھتے ہیں۔ ان کی تعلیمات کی بنیاد الٰہی قوانین پر ہوتی ہے۔ جیسے اسلام کے اولین دور میں قران شریف ہدایت کا ذریعہ تھا لیکن جب وقت کے ساتھ سوسائٹی بدلتی ہے مذہب پھیلتا ہے نئے مسائل سامنے آتے ہیں تو اسلام میں ان کے حل کے لیے رسول اللہ (ﷺ) کی تعلیمات پر عمل کیا گیا لیکن جب سوسائٹی میں اور تبدیلیاں آتیں تو مفتوح قوموں کے لوگ مسلمان ہونا شروع ہوئے تو اب ان کی ہدایت کے لیے ضرورت ہوئی کہ دین کی نئ تشریح کی جائے اور اسے وقت کے مطابق ضرور بنایا جائے اس مرحلے پر قرآن کی تفسیروں کا سلسلہ شروع ہوا۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ ہر دور میں نئ تفسیر کے ذریعے اسلام کو وقت کے تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی گئی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ علماء اور فقہانے اپنے علم اور تشریح سے مذہب کو بدلنے کی کوشش کی لہٰذا اولین طور پر اسلام میں دو فرقے وجود میں آئے۔ ایک وہ جو قران کے متن پر عمل کرتے ہیں دوسرے وہ جو متن کی نئ تفصیل اور تشریح کرتے ہیں۔ یہ صرف اسلام ہی میں نہیں ہے بلکہ دوسرے مذاہب بھی اس سے دوچار ہیں۔

اب میں یہاں سے یہ وضاحت کرنا چاہوں گا کہ فرقے کیونکر وجود میں آتے ہیں۔ اس کا تاریخی پس منظر یہ ہے کہ اپنے ابتدائی دور میں ہر مذہب کا دائرہ محدود ہوتا ہے اور اس کی تعلیمات بھی سادہ ہوتیں ہیں۔ لیکن جب سوسائٹی پھیلتی اور ترقی کرتی ہے تو نئے پیشہ وارانہ طبقے وجود میں آتے ہیں، نئ ایجادات تبدیلی کا باعث بنتی ہیں۔ تو اس مرحلے پر مختلف پیشہ ور طبقات اور برادریوں کو اگر اپنے مفادات کے لیے موجود مذہبی تعلیمات سے رہنمائی نہیں ملتی ہے تو وہ اپنے مفادات کی تکمیل کے لیے مذہب کی نئ تشریح کے لیے اپنا علیحدہ فرقہ بنا لیتے ہیں۔ عیسائیت میں یہ مثال CALVIN فرقے کی ہے جس نے سود کو جائز قرار دے کر تاجروں کو سہولت دی۔ اگرچہ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ فرقہ واریت مذہبی اتحاد کو ختم کرتی ہے۔ لیکن دوسری جانب ہم دیکھتے ہیں کہ فرقہ واریت مذہبی جمود کو توڑ

کر اور اس کی نئی تشریح کر کے مذہب کو ایک نئی زندگی دیتی ہیں۔ فرقہ وارایت اس وقت فساد کا باعث ہوتی ہے جب ہر فرقہ یہ یقین رکھتا ہے کہ وہ سچائی پر ہے اور دوسرے گمراہ ہیں۔ تو اس صورت میں ہر فرقے کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ یا تو وہ دوسروں کو اپنے میں شامل کر لیں یا انہیں گمراہ سمجھتے ہوئے انکا خاتمہ کر دیں۔ پاکستانی سوسائٹی اس وقت اس صورت سے دوچار ہے۔

بلند اقبال

ڈاکٹر صاحب اب میرا سوال یہ ہے کہ دیوبندی اور بریلوی فرقے ہندوستان میں کیونکر وجود میں آئے؟

مبارک علی

دیوبند کی تاریخ یہ ہے کہ 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد جب مغل سلطنت کا خاتمہ ہوگیا اور ہندوستان کے مسلمانوں کو شدت سے اس بات کا احساس ہوا کہ اب اقتدار انگریزوں کے ہاتھ میں ہے اور انکا تحفظ کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ خاص طور پر یہ احساس ہندوستان کی مسلم اشرافیہ کو تھا، چنانچہ 1867ء میں مولانا قاسم نانوتوی اور مولانا رشید گنگوہی نے دیوبند میں مدرسے کی بنیاد ڈالی جو کہ دارالعلوم کہلاتا تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی دینی لحاظ سے راہنمائی کی جائے اور جن تبدیلیوں سے معاشرہ گزر رہا ہے۔ مذہب اسلام کو ان بدلتے ہوئے حالات میں برقرار رکھا جائے۔ مدرسے کا سب سے زیادہ اہم شعبہ دارلافتاء تھا جہاں ہندستان بھر سے مسلمان سیاسی، سماجی، معاشی اور مذہبی مسائل پر سوالات پوچھتے تھے اور فتوے طلب کرتے تھے۔ دیوبند کا مدرسہ ہر سال ان فتوؤں پر مشتمل مجموعہ شائع کیا کرتا تھا۔ اگر ان فتوی کا مطالعہ کیا جائے تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ اس دور میں انگریزی اقتدار کی وجہ سے جو تبدیلیاں آ رہی تھیں مسلم معاشرہ اور علماء ان کو کس نظر سے دیکھ رہے تھے اور ان کا کیا ردعمل تھا۔ مثلاً جب بسکٹ اور کیک کا رواج ہوا تو لوگوں نے یہ سوال

پوچھا کہ کیا ان کا کھانا جائز ہے۔ ایلوپیتھی کی دوائیوں کے بارے میں بھی استفسار کیا گیا کہ کیا ان کا استعمال صحیح ہے؟ پھر جب نئی ایجادات آئیں تو ان پر بھی فتوے طلب کئے گئے۔ جیسے لاؤڈ اسپیکر جس کا استعمال ابتداء میں ناجائز قرار دیا گیا۔ کیمرہ اور اس سے لیے جانے والے فوٹوز کو بت پرستی کے قریب بتایا گیا۔ ریڈیو سننا اس لیے حرام ٹھہرا کیونکہ اس میں گانے اور مذہبی پروگراموں کا ساتھ ہونا ناقابل برداشت تھا۔ اس ردعمل سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہمارے علماء اور فقہا زمانے کی تبدیلیوں سے کس قدر ناواقف تھے۔ دیوبند کے علماء کا بنیادی عقیدہ یہ تھا کہ اسلام کی اصل تعلیمات پر عمل کیا جائے اور نئی تبدیلیوں کے علماء نے شیعہ مسلک کے لوگوں کو کافر قرار دے دیا تھا لہٰذا دیوبند کے ماننے والے قدامت پرست مذہب نقطہ نظر کی پیروی کرتے تھے۔

بلند اقبال

ڈاکٹر صاحب اپنے دیوبند فرقے کے مطلق تو بتایا اب ذرا بریلوی فرقے کے متعلق بتائیے کہ اس کا تاریخی پس منظر کیا ہے؟

مبارک علی

بریلوی فرقے کا وجود بھی برطانوی دورِ حکومت میں ہوا۔ ان میں اور دیوبند کے فرقے میں فرق یہ ہے کہ دیوبندی اسلام کی اصلی تعلیمات کا احیاء چاہتے ہیں جبکہ بریلویوں کا یہ کہنا ہے کہ ہندوستان میں رہتے ہوئے اسلام جن ارتقائی مراحل سے گزرا ہے اور اس میں جو روایات اور رسم و رواج شامل ہوگئے ہیں۔ انہیں مذہب کا حصہ تسلیم کر لینا چاہیے۔ جیسے پیر پرستی، مزاروں کا احترام، اولیاء اکرام کا عرس وغیرہ میلاد شریف کی محفلیں منعقد کرنا، نعت گوئی کا اہتمام کرنا اور ذکر وغیرہ، بریلوی نقطہ نظر سے ان روحانی سرگرمیوں کی وجہ سے اس کے ماننے والے روحانی اور ثقافتی طور پر متحد ہو جاتے ہیں۔ ان کی زندگی میں توانائی آ جاتی ہے۔ یہاں میں خاص طور پر وضاحت کروں گا کہ کیونکہ دیوبندی اصلی اسلامی تعلیمات

پر سختی سے عمل کرتے ہیں۔اس لیے اس کے پیروکار زیادہ تر متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ جب کہ بریلوی فرقے کو ماننے والوں کی اکثریت عام لوگوں کی ہے۔لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ دونوں فرقے ایک دوسرے کو کافر قرار دیتے ہیں اور مذہبی تضادات کو ابھارتے ہیں۔

بلند اقبال

ڈاکٹر صاحب یہ بتایئے کہ دارُالحرب اور دارُالسلام کا کیا مسئلہ ہے؟

مبارک علی

یہ مسئلہ بھی عہد وسطیٰ کی پیداوار ہے جب کہ کچھ علماء اور فقہاء نے یہ فتویٰ دیا کہ اگر کسی ملک میں مسلمانوں کو عبادات کی آزادی نہیں ہے۔تو اس صورت میں ان پر دو باتیں فرض ہیں یا تو وہ جہاد کر کے اس ملک کو دارُالحرب سے دارُالسلام میں تبدیل کر لیں اور یا پھر ہجرت کر کے اُس ملک میں چلیں جائیں جہاں انہیں مذہبی آزادی ہو۔

ہندوستان میں ہم اس مسئلے کو اس وقت دیکھتے ہیں جب سید احمد کی تحریک ''محمدی'' نے ہندوستان کو دارُالحرب قرار دیا اور ان کے ساتھ ہی ہجرت کر کے صوبہ خیبر پختونخواہ میں آئے اور یہاں اسلامی حکومت قائم کی۔لیکن اس زمانے میں کچھ علماء نے ان سے اختلاف کیا کیونکہ ہندوستان میں مسلمانوں کو مذہبی آزادی ہے۔اس لیے یہ دارُالحرب نہیں ہے اور نہ ہی مسلمانوں پر جہاد لازم ہے۔دوسری مرتبہ ہندوستانی مسلمان اس مسئلے سے اس وقت دوچار ہوئے جب 1920ء کی دہائی میں ہندوستان میں خلافت تحریک جاری تھی۔اس موقع پر بھی کچھ علماء نے جن میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور مولانا عبدالکلام آزاد بھی شامل تھے ہندوستان کو دارُالحرب قرار دیتے ہوئے یہ فتویٰ دیا کہ مسلمانوں کی ایک تعداد نے اپنا گھر بار چھوڑ کر افغانستان کی طرف ہجرت کی۔لیکن افغانستان ان مہاجروں کو برداشت نہیں کر سکا اور یہ لوگ تباہ و برباد اور پریشان حال ہو کر واپس ہندوستان آئے۔یہاں خاص بات یہ ہے

کہ بریلوی فرقے نے ہندوستان کو دارُالحرب قرار نہیں دیا اس لیے وہ جہاد اور ہجرت دونوں سے دور رہے۔ افسوس یہ ہے کہ اس مسئلے نے مسلمانوں کے مذہبی اور سیاسی دونوں مسائل کو حل نہیں کیا۔ بلکہ اس کے برعکس اس نے انہیں مشکلات سے دوچار کیا۔

بلند اقبال

ڈاکٹر صاحب یہ بتایئے گا کہ کیا پاکستان کے قیام میں بھی دارُالحرب کا کوئی کردار ہے؟ اور پاکستان کی ساخت میں آنے والی تبدیلیاں وقت کے ساتھ آئیں یا اسے بطور ورثہ ملیں۔

مبارک علی

آپ نے جو دارُالحرب کا تعلق تحریک پاکستان سے ملانے کی بات کی ہے تو یہ صحیح نہیں ہے۔ مگر یہ ضروری ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں دارُالحرب اور دارُالسلام کا جو تصور بیٹھا ہوا تھا اور ہجرت کے بارے میں جو ان کے خیالات تھے اس کی جھلکیاں ہمیں تقسیم میں نظر آتی ہیں۔ قیام پاکستان کو ہندوستانی مسلمانوں نے ایک آئیڈیل ملک سمجھا کہ جہاں وہ ہندوؤں کے غلبے سے آزاد ہونگے اور پاکستان میں ہجرت کرنے والوں نے بھی اسے ایک فرقہ سمجھتے ہوئے ہجرت کو مقدس قرار دیا اور اسے مسلمانوں کی پہلی ہجرت جو مکے سے مدینہ ہوئی تھی اُس سے اس کا رشتہ جوڑ دیا۔ حال ہی میں ہندوستان سے ایک کتاب چھپی ہے جس کا عنوان ''ایک نئے مدینے کی تخلیق'' جس میں مصنف نے وضاحت کی ہے کہ پاکستان کے وجود میں ایک نئی اسلامی ریاست قائم ہونے کے تصورات ہیں۔

اب رہا آپ کا دوسرا سوال کہ کیا مذہبی فرقہ وارانہ ماحول پاکستان میں شروع ہی سے تھا یا اس کی ابتداء بعد میں وقت کے ساتھ ہوئی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ پاکستان کے ابتدائی دنوں میں ہمیں یہاں پر کسی بھی قسم کا فرقہ وارانہ ماحول نظر نہیں آتا ہے۔ میں خصوصیت سے سندھ کا ذکر کروں گا کہ جہاں میں نے کافی وقت گزارا ہے اور جس کے

بارے میں کچھ جانتا ہوں۔ پاکستان سے قبل اور بعد کے ابتدائی دور میں یہاں شیعہ سنی تضاد نہیں تھا اور نہ ہی دوسرے مذہبی فرقوں کے درمیان جھگڑے تھے لیکن جب شمالی ہندوستان سے مہاجر یہاں آئے تو یہ اپنے ساتھ وہاں کی مذہبی، اصلاحی، تحریکوں کا ورثہ بھی لائے یعنی دیوبندی، وہابی، اہل حدیث اور بریلوی وغیرہ شیعہ مسلک کے ماننے والے بھی اوڈ کی تمام شیعہ رسومات کو اپنے ہمراہ لے کر آئے، ان فرقوں کے ماننے والوں کا خیال یہ تھا کہ سندھ کے لوگ پکے اور راسخ العقیدہ مسلمان نہیں ہیں لہٰذا ان میں تبلیغ کر کے ان کو اپنے اپنے فرقوں میں شامل کیا جائے۔ اس ماحول کی وجہ سے سندھ میں فرقہ وارانہ تضاد پیدا ہوئے جنہوں نے فسادات کی شکل بھی اختیار کی۔

اب رہا پنجاب تو یہاں کے حالات مختلف تھے۔ کیونکہ پنجاب کا شمالی ہند سے گہرا تعلق رہا ہے۔ اس لیے یہاں مذہبی فرقے بھی تھے اور مذہبی اصلاحی تحریکیں بھی کیونکہ پنجاب آریا سماج اور عیسائی مشنری کی سرگرمیوں کا مرکز بھی رہا ان کے درمیان مناظرے بھی ہوتے رہے۔ اس لیے یہاں مذہبی فرقے پنجاب کے عوام میں مذہبی جذبے اور جوش کو پیدا کرتے رہے۔ ان کے جھگڑے غیر مسلموں سے بھی رہے اور باہمی بھی یہ ایک دوسرے کے دست و گریبان رہے۔ پنجاب میں خاص طور پر مذہبی انتہاء پسندی کی پہلی مثال 1953ء میں احمدیوں کے خلاف ہونے والا فساد تھا جس میں مسجد احرار نے مکمل طور پر شرکت کی تھی۔ اس کے بعد سے ہم دیکھتے ہیں کہ احمدیوں کے خلاف مسلسل مذہبی اشتعال پھیلایا جاتا ہے اور ان کے خلاف ہنگامہ آرائی کی جاتی ہے۔ احمدیوں کے بعد دوسرا ٹارگٹ عیسائی اقلیت تھے یہ بھی عدم تحفظ کا شکار ہیں۔

دوسرے پنجاب میں بھی شیعاؤں کے خلاف فسادات کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ سندھ میں اب تک احمدیوں، عیسائیوں اور ہندوؤں کے خلاف بہت زیادہ مخالفانہ جذبات اُبھرے ہیں۔

بلند اقبال

یہاں میں چاہوں گا کہ ہم پاکستان کی تاریخ کی مدد سے فرقہ وارانہ فسادات کا جائزہ لیں کہ کس طرح ارتقائی طور پر یہ جذبات آگے بڑھے؟

مبارک علی

پاکستان میں اسلامائزیشن کا عمل 1949ء میں پاس ہونے والی قراردادِ مقاصد سے ہوتا ہے۔

بلند اقبال

بتائے گا کہ کیا لیاقت علی خان پاکستان کو اسلامی ریاست بنانا چاہتے تھے؟

مبارک علی

قراردادِ مقاصد میں جن باتوں یا نکات کا اظہار کیا گیا ہے اس کا تعلق اسلامی ریاست کی ساخت پر ہے۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ لیاقت علی خان نے اسلامی ریاست کی بنیادیں فراہم کیں۔ پاکستان کا اسلامی دستور بنانے کے لیے انھوں نے علماء کی مدد طلب کی سید سلیمان ندوی اور پروفیسر حمید اللہ کو ہندوستان سے بلایا لیکن چونکہ ہمیں تاریخ بتاتی ہے کہ چار یا پانچ علماء بھی کسی ایک بات پر متفق نہیں ہوتے ہیں۔ اس لیے دستور کے بارے میں بحث و مباحثے تو ہوئے لیکن کوئی دستور نہ بن سکا۔

جب چوہدری محمد علی وزیر اعظم ہوئے تو انھوں نے 1935ء کے ایکٹ کے تحت کچھ ترامیم کے ساتھ 1956ء کا دستو بنایا۔ جسے ایوب خان نے ختم کر کے 1962ء میں اپنے نئے دستور کا اعلان کیا۔ جب اس کا پہلا ایڈیشن سامنے آیا تو اس کے الفاظ یہ تھے۔

"Constitution of Republic of Pakistan" اس پر مذہبی حلقوں کی جانب سے اعتراض ہوا کہ اسے اسلامی ریپبلک کیوں نہ لکھا گیا۔ حکومتی حلقوں نے بجائے اس کے کہ اپنے موقف کی ہدایت کرتے۔ اسے ٹائپنگ کی غلطی کہہ کر اسلامک کا اضافہ کردیا۔

مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد بھٹو صاحب کے دور میں 1973ء کا دستور بنایا گیا تو اس میں پاکستانی ریاست کا مذہب اسلام قرار دیا گیا۔ اس کے صدر اور وزیراعظم ہونے کے لیے بھی مسلمان ہونے کی شرط طے ہوئی۔ جب ضیاء الحق اقتدار میں آئے تو انہوں نے اسلامائیزیشن کے عمل کو پورا کر کے ریاست کو اسلامی بنا دیا۔ لہٰذا اگر دیکھا جائے تو موجودہ پاکستان ضیاء الحق کا پاکستان ہے۔

اب ستم ظریفی یہ ہے کہ ایک طرف تو پاکستان کی سوسائٹی میں مذہبی رسم و رواج اور جذبات کا غلبہ ہے۔ عمرے اور حج پر جانے والوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ میلاد اور نعت گوئی کی محفلیں منعقد کی جا رہی ہیں۔ قرآن کا درس دیا جا رہا ہے۔ طالب علموں کے نصاب میں مذہبی تعلیمات کا اضافہ ہو رہا ہے۔ عورتیں حجاب اور برقعوں میں نظر آتیں ہیں۔ لیکن دوسری جانب ایسی سوسائٹی میں جھوٹ دھوکا فریب اور بدعنوانیاں اپنے عروج پر ہیں۔ کھانے پینے کی اشیاء میں ملاوٹیں ہو رہی ہیں۔ جعلی ادویات بنائی جا رہی ہے۔ اور اخلاقی قدروں کو پامال کر کے ذاتی مفادات کو آگے بڑھایا جا رہا ہے۔ یہ دونوں متضاد رویے ایک بڑے ہی عمدہ توازن کے ساتھ سوسائٹی میں جاری ہیں۔ اور کسی کو اس ماحول میں ان تضادات کی وجہ سے زندگی گزارنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی ہے۔

بلند اقبال

کیا ہم پاکستان کو سیاسی اصلاح میں جمہوری کہہ سکتے ہیں؟

مبارک علی

نہیں پاکستان کو ہم ایک جمہوری ملک نہیں کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ یہاں سیاست پر جاگیرداروں، وڈیروں اور سرداروں کا قبضہ ہے۔ یہی لوگ منتخب ہو کر پارلیمنٹ میں آجاتے ہیں۔ اور ایسی کوئی قانون سازی نہیں کرنے دیتے کہ جس سے عوامی فلاح و بہبود ہو۔ اس لیے اسے ہم جاگیردارانہ جمہوریت تو کہہ سکتے ہیں۔ لیکن عوامی جمہوریت نہیں۔ اس وقت جتنی بھی سیاسی پارٹیاں ہیں ان پر سیاسی خاندانوں کا قبضہ ہے اور انتخابات اب دولت کی بنیاد پر جیتے جاتے ہیں۔ ہمیں مستقبل میں بھی ایسی کوئی امید نظر نہیں آتی ہے کہ جب قانون سازی کے ذریعے نئی اصطلاحات ہوں یا سرداری کا خاتمہ ہو۔

بلند اقبال

یہ کہاں تک صحیح ہے کہ پاکستان کو مسلمانوں کے حقوق کے لیے بنایا گیا تھا یا اسلام کے تحفظ کے لئے؟

مبارک علی

اگر ہم تحریک پاکستان کا مطالعہ کریں تو ابتداء ہی سے جو بات بار بار کہی گئی وہ یہ تھی کہ چونکہ ہندوستان میں مسلمان اقلیت میں ہیں لہٰذا ان کے حقوق کا تحفظ ہونا چاہیے۔ جداگانہ انتخاب کی بنیاد بھی یہی تھی کہ مسلمان اپنے امیدواروں کو منتخب کر کے اپنے حقوق حاصل کریں۔ قراردادِ لاہور میں کہیں بھی مذہب کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ لیکن تحریک کا مذہب سے تعلق اس وقت شروع ہوا جب دوقومی نظریے کی بات کی گئی۔ اور یہ اعلان کیا گیا کہ مسلمانوں کے حقوق کے لیے ایک نئی مملکت کا قیام ضروری ہے۔ اب جب بات مسلمانوں کی گئی تو اس کا مطلب تھا کہ ان کے حقوق میں مذہبی عبادت اور رسم و رواج بھی آجاتے ہیں۔ اس لیے علماء نے یہ دلیل دی کہ اسلامی تعلیمات اور روایات کے بارے میں مسلم لیگ

کا مغربی تعلیم یافتہ طبقہ کچھ نہیں جانتا تھا لہٰذا یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم مسلمانوں کے مذہبی حقوق اور ان کے عقیدے کے تحفظ کے لیے ان کی راہنمائی کریں۔ لہٰذا اس منطق کے تحت مسلم یا اسلامی ریاست کو چلانے کا حق علاء کا ہے۔ اس کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ جمہوری نظام اور عوام کے ووٹوں کی بھی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اس بات کا اعلان کچھ انتہاء پسند علماء بار بار کر چکے ہیں۔

بلند اقبال

ڈاکٹر صاحب یہ بات ذرا سمجھایئے گا کہ سعودی عرب اور ایران کے بڑھتے ہوئے اختلافات کی جنگ پاکستان کی سرزمین پر کیوں لڑی جا رہی ہے؟

مبارک علی

سب سے پہلے تو میں یہ وضاحت کر دوں کہ سعودی عرب نامی ملک پہلی جنگ عظیم کے بعد وجود میں آیا۔ حجاز اور نجد کو ملا کر سعودی حکمران خاندان نے اس کا نام بدل کر سعودی عریبیہ کر دیا یہ خاندان وہابی مسلک کا ماننے والا ہے۔ اس لیے انہوں نے آتے ہی مزاروں، قبروں اور بہت سی مذہبی عمارتوں کو مسمار کیا۔ جس کی وجہ سے ہندوستان میں علماء کا ایک طبقہ تو حامی رہا اور دوسرا طبقہ سخت مخالف۔ پاکستان بننے کے بعد بھی سعودی عرب کا پاکستان کی سیاست پر کوئی اثر نہیں تھا۔ یہ 1970ء کی دہائی میں جب لاہور میں اسلامی ممالک کا اجلاس ہوا اور شاہ فیصل یہاں آئے تو اس کے بعد سے دونوں ملکوں کے قریبی تعلقات بہتر ہوئے۔ ان تعلقات کو قریب لانے میں ایک تو پاکستان کے مرکز کا تعلق رہا جو بڑی تعداد میں سعودی عرب گئے۔ دوسرے جب سعودیوں کے پاس بغیر کسی محنت کے پیٹرول کی دولت آئی تو اسے انہوں نے وہابی یا تبلیغی پھیلاؤ کے لیے استعمال کیا۔ اس دوران بڑی تعداد میں پاکستان میں سعودی پیسہ آیا اور یہ پیسہ وہابی مسلک کے علماء کو دیا گیا۔ جس کی وجہ سے تاریخ میں پہلی مرتبہ علماء کا درجہ معاشرے میں بلند ہوا۔ نئی مساجد تعمیر ہوئیں، مدارس کھولے گئے

دوسرے فرقوں کے خلاف کتابیں پمفلٹس اور اخبارات کی اشاعت ہوئی۔ مساجد میں خطبوں کے ذریعے تبلیغی یا وہابی علماء نے دوسرے فرقوں کے خلاف لوگوں کے جذبات کو مشتعل کیا۔

دوسری جانب جب ایران میں انقلاب آیا تو اس کی وجہ سے پاکستان میں شیعہ مسلک کے لوگوں میں ایک نیا جذبہ اور توانائی آئی اور انہوں نے اپنے رسم و رواج کا کھلے عام اظہار کیا۔ اس کی وجہ سے پاکستان میں شیعہ سنی فسادات کی ابتداء ہوئی۔ خاص طور پر بلوچستان میں ہزارہ برادری کا قتل عام کیا گیا اور پاراچنار میں فرقے وارانہ فسادات میں بڑی تعداد میں شیعہ مارے گئے۔ آج بھی امام بارگاہوں میں خودکش حملے جاری ہیں۔ شیعہ سنی فسادات ہر روز پاکستان کے کسی نہ کسی شہر میں اچانک وقوع پذیر ہوتے ہیں اور ملک کا ماحول افسردہ ہو جاتا ہے۔

لیکن میں یہاں یہ اضافہ کرنا چاہوں گا کہ ان تمام فسادات کے باوجود پاکستان میں شیعہ سنی مسلک کے لوگوں کے درمیان دشمنی یا عداوت نہیں آئی ہے۔ آج بھی انفرادی طور پر ایک دوسرے کی دوستیاں ہیں۔ شادی بیاہ بھی ہوتے ہیں اور سماجی طور پر ایک دوسرے سے قریب بھی ہیں۔ یعنی مجموعی طور پر فسادات دونوں مسلک کے لوگوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ اب آپ کا جو سوال ہے کہ سعودی عرب اور ایران کی جنگ پاکستان میں کیوں لڑی جا رہی ہے۔ تو اس کی وجہ دونوں ملکوں سے آنے والا پیسہ ہے۔ اگر اس بیرونی امداد کو ختم کر دیا جائے تو فرقہ وارانہ نفرتوں کی بنیادیں کمزور پڑ جائیں گی۔ اور امید تو یہی ہے کہ سعودی عرب اور ایران دونوں جس طرح اقتصادی مسائل کا شکار ہو رہے ہیں۔ تو ان کی امداد بھی کم سے کم ہوتی چلی جائے گی۔ چونکہ سعودی عرب کے پاس زیادہ پیسہ ہے اس لیے اس سے عطیات لینے والے زیادہ سرگرم اور پرجوش ہیں۔

بلند اقبال

اب میں آپ سے تاریخ کے حوالے سے کچھ سوالات کرنا چاہونگا۔ مجھے اس کا احساس ہے کہ تاریخ کے بارے میں آپ جو نظریات رکھتے ہیں ان کی مخالفت ہے لیکن کیا

نصاب کی تاریخی کتابیں فرقہ وارانہ تعلقات کو بڑھا رہی ہیں؟

مبارک علی

اپنے بارے میں یہ کہنا چاہوں گا کہ میں نے تاریخ کا ایک متبادل نقطہ نظر پیش کیا ہے۔ جو ریاستی تاریخ سے بالکل مختلف ہے اس لیے اسے حکمران طبقوں میں پزیرائی نہیں ملی جن میں خاص طور سے آئی ایچ قریشی اور معین الحق ہیں۔ یہ ہندوستان کے فرقہ وارانہ ماحول کی پیداوار ہیں۔ اس لیے انہوں نے اپنی تاریخ نویسی میں دوقومی نظریے کو خصوصیت سے اُبھارا ہے اور اُسے پاکستان کی بنیاد بنایا۔ اُس وقت تک نظریہ پاکستان کی اصطلاح استعمال نہیں ہوتی تھی۔ اس کی جگہ اسلامی نظریے کا استعمال ہوتا تھا۔

اس فرقہ وارانہ تاریخ نویسی کے نتیجے میں جب نصابی کتابیں لکھیں گئیں اور ان میں مسلمانوں اور ہندوؤں کو دو علیحدہ علیحدہ قوموں کی صورت میں پیش کیا گیا تو اس بات کی پوری کوشش کی گئی کہ دونوں قوموں کے اختلافات کو اُبھارا جائے اور یہ ثابت کیا جائے کہ دونوں میں کوئی چیز مشترک نہیں ہے۔ یعنی اس قسم کی باتیں کہ مسلمانوں کی عبادت گاہیں کھلی اور روشن ہوتی ہیں اور ہندوؤں کی تنگ اور تاریک، ہندو بغیر سلے کپڑا پہنتے ہیں جیسے دھوتی اور ساڑھی جبکہ مسلمان سلے ہوئے کپڑے پہنتے ہیں۔ مسلمان گوشت خور ہیں جبکہ ہندو سبزی کھاتے ہیں۔ بلکہ ایک صاحب نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ کھجور اور زیتون مسلم ہیں اور پیپل اور برگد ہندو، اونٹ اور گھوڑا اسلامی جانور ہیں جبکہ گائے ہندو، جب نصابی کتابوں میں اس قسم کے تصورات کو شامل کر دیا جائے تو نوجوان طالب علم ابتداء ہی سے تنگ نظری کا شکار ہو جاتے ہیں۔

نصابی کتابوں کا دوسرا اہم عنصر ہندوستان کی مخالفت اور ہندوؤں سے نفرت ہے اور اس بات کو بار بار کہا جاتا ہے کہ پاکستان بننے کے نتیجے میں مسلمانوں کو ہندوؤں کے غلبے سے نجات ملی۔ اب جب یہ نصاب کی کتابیں پاکستان میں ہندو اقلیت کے نوجوان پڑھتے ہیں تو آپ خود اندازہ لگائیں کہ وہ ذہنی طور پر کسی اذیت سے گزرتے ہونگے اس لیے پاکستان میں

جہاں فرقہ وارانہ جذبات کا تعلق ہے اس میں نصابی کتابوں کا بھی اہم کردار ہے۔

بلند اقبال

ڈاکٹر صاحب کیا آئین میں بھی کوئی ایسی شق ہے کہ نظریہ پاکستان پر تنقید کرنے والا سزا کا مستحق ہوگا؟

مبارک علی

جی آئین میں تو کہیں ایسی شق موجود نہیں ہے لیکن جب نواز شریف پہلی مرتبہ وزیراعظم بنے تھے تو انہوں نے یہ اعلان کیا تھا کہ وہ ضیاء الحق کے مشن کو پورا کریں گے لہٰذا پاکستان کے پینل کوڈ میں نظریہ پاکستان کے خلاف بولنے، لکھنے یا اشاروں اور کتابوں میں تنقید کرنے پر 10 سال قید بامشقت ہے۔ لیکن خاص بات یہ ہے کہ نظریہ پاکستان کی تعریف اور تشریح موجود نہیں کہ یہ کیا ہے۔ کیا جناح صاحب پر تنقید کرنا بھی نظریے کے خلاف ہے یا خود نواز شریف پر تنقید کرنا بھی جرم ہے۔

حال ہی میں HEC پاکستان نے تمام تعلیمی اداروں کو ایک نوٹس بھیجا ہے کہ کسی بھی طالب علم کو ایم فل یا پی ایچ ڈی کے لیے ایسا موضوع نہ دیا جائے جو پاکستان کے نظریے کی مخالفت میں ہو۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ہمارے حکمران طبقے تاریخ سے کس قدر خوفزدہ ہیں۔

بلند اقبال

آج اس گفتگو میں ہم نے بہت سے موضوعات پر بات کی جن میں فرقہ وارانہ جماعتیں، ان کے اختلافات، سعودی عرب اور ایران کا تضاد، پاکستان میں شیعہ سنی فسادات نظریہ پاکستان، نصابی کتابیں وغیرہ وغیرہ اب میں یہاں یہ سوال کرنا چاہوں گا کہ کیا ان مایوس کن حالات میں امید کی کوئی روشنی نظر آتی ہے؟

مبارک علی

میں سب سے پہلے تو اس بات کی جانب اشارہ کروں گا کہ اس وقت پاکستان فرقہ وارانہ نفرتوں کی وجہ سے جس دہشت گردی اور فسادات کا شکار ہو رہا ہے۔ اس نے ایک جانب تو ریاستی اداروں کی ساری توجہ دہشت گردی کے خلاف کر دی ہے جس کی وجہ سے عوامی مفادات اور فلاح و بہبود کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ فسادات کی روک تھام کا ریاست پر زبردست معاشی بوجھ بھی ہے قانون کا نفاذ کرنے والے ادارے اس ماحول میں ذہنی دباؤ کا شکار بھی ہیں۔ سماجی طور پر لوگوں میں عدم تحفظ کا احساس بڑھتا جا رہا ہے۔ کیونکہ دھماکے عبادت گاہوں سے لے کر بازاروں تک میں ہوتے ہیں اس لیے لوگوں کی سماجی سرگرمیاں خوف اور ڈر کا شکار ہیں۔ فسادات میں مارے جانے والے لوگوں کے خاندان مفلسی، غربت اور بے بسی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ جو لوگ زخمی ہو جاتے ہیں وہ پوری زندگی اپاہج بن کر زندگی گزارتے ہیں لہٰذا یہ دہشت گردی پاکستان کو تباہی کی جانب لے جا رہی ہے۔ اب رہی پاکستان کی نظریاتی اساس تو کوئی بھی نظریاتی ملک قانونی پابندیاں عائد کر کے آزادی کا خاتمہ کرتا ہے کیونکہ نظریہ کے خلاف کسی تحریر یا تقریر کو برداشت نہیں کیا جاتا ہے۔ لیکن ریاست کوئی بھی ہو وہ نظریے کے بوجھ کو زیادہ عرصے تک برداشت نہیں کر سکتی ہے۔ روس کی نظریاتی ریاست بھی ستر (70) سال بعد بکھر گئی، اب دیکھنا یہ ہے کہ پاکستان کی ریاست کب تک نظریے کے بوجھ کو اٹھائے رکھے گی۔

موجودہ عالمی صورتحال میں قوموں کی ترقی کے لیے جمہوریت اور سیکولر خیالات کا ہونا لازمی ہے۔ سیکولرازم سے مراد یہ ہے کہ ریاست مذہبی معاملات میں غیر جانب دار ہو جب کہ معاشرے میں لوگ اپنے عقیدے کے مطابق زندگی گزاریں لیکن کسی کو یہ حق نہیں ہونا چاہیے کہ وہ دوسرے کے مذہبی معاملات میں دخل دے اور اپنے عقیدے کو مسلط کرے کی کوشش کرے۔

بلند اقبال

کیا نظریہ کے ٹوٹنے سے ریاست بھی ٹوٹ جاتی ہے؟

مبارک علی

نہیں یہ ضروری نہیں ہے اگر نظریہ ٹوٹتا ہے تو ریاست کو چاہیے کہ وہ متبادل نظامِ حکومت تلاش کرے جن میں لوگوں کو آزادی ہو۔

بلند اقبال

کیا یہ ممکن ہے کہ پاکستان بھی اس راستے پر چل پڑے کہ جس پر چل کر بنگلہ دیش نے خود کو مذہبی گرفت سے نکالا اور خود کو سیکولر ہونے کا اعلان کیا؟

مبارک علی

بنگلہ دیش کا یہ کارنامہ اس کے سیاسی راہنماؤں کی دانشمندی کا نتیجہ ہے۔ انہوں نے ملک کے وسیع تر مفاد میں سیکولرازم کو اختیار کرتے ہوئے ہندوستان سے بھی خوشگوار تعلقات قائم کیے۔ پاکستان میں ایسا ہونا فی الحال ممکن نہیں کیونکہ اس کی دونوں بڑی جماعتیں مذہبی جماعتوں سے زیادہ مذہبی ہیں۔ ان کی لیڈر شپ میں نہ کوئی سیاسی وژن ہے اور نہ ہی وسیع النظری لیکن ہم یہ امید ضرور کرتے ہیں کہ معاشرے طویل عرصے تک جامد اور ساکت نہیں رہتے ہیں۔ ان میں تبدیلی آتی ہے اور آگے بڑھنے کے راستے کھلتے ہیں۔ اس لیے اگرچہ حالات مایوس کن ضرور ہیں مگر ہمت ہارنے کی ضرورت نہیں ہے۔ حالات کو بدلنے کی ضرورت ہے۔

بلند اقبال

تو کیا ہماری آج کی گفتگو کا کلیدی لفظ ''سیکولرازم'' ہے جو ہمارے مسائل کو حل کرنے میں مدد دے گا؟

مبارک علی

ہم یہ نہیں کہتے کہ سیکولرازم واحد حل ہے تمام مسائل کا لیکن یہ ضرور ہے کہ یہ ذہن کو پابندیوں سے آزاد کرتا ہے اور یہ آزادی سوسائٹی کی ترقی کا سبب بنتی ہیں۔

بلند اقبال

ڈاکٹر صاحب آپ نے سنجیدہ موضوعات پر جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس کے لیے شکریہ کا لفظ بہت چھوٹا ہے۔ ہم اُمید کرتے ہیں کہ آئندہ بھی آپ ہمارے ساتھ گفتگو کر کے ناظرین کی راہنمائی کرتے رہیں گے۔

☆......☆......☆

3- تاریخ اور انقلاب

بلند اقبال

ناظرین آج ہم دنیا میں ہونے والے انقلابات کے بارے میں بات کریں گے۔ انقلاب کیوں آتے ہیں بطور ابنِ خلدوم: جب کوئی نظام ٹوٹ پھول کا شکار ہو جائے اور اس میں دراڑیں پڑ جائیں تو تبدیلی ناگزیر ہوتی ہے۔ ہیگل کے جدلیاتی فلسفے کے مطابق۔ تھیسس ، اینٹی تھیسس تاریخ کے عمل کو آگے بڑھاتا ہے۔ چے گویرا کے مطابق انقلاب کوئی پکا ہوا پھل نہیں ہوتا ہے جو آپ کی گود میں گر جائے۔ اس کے حصول کے لیے جدوجہد کرنی پڑتی ہے تو ناظرین تاریخ میں انقلابات آتے رہے ہیں۔ فرانس، روس، چین، کیوبا اور ویت نام اور یہ دنیا کی تاریخ کو بھی بدلتے رہے ہیں۔ پاکستان میں آج کل انقلاب کا نعرہ لگایا جاتا ہے اور اس کے ذریعے تبدیلی کی بات کی جاتی ہے۔ آج کے اس پروگرام میں ہم پہلے انقلاب کی تاریخ کے بارے میں سوالات کریں گے۔ اہم انقلابات کا تذکرہ کریں گے اور دوسرے حصے میں پاکستان کے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے وضاحت چاہیں گے کہ کیا پاکستان میں انقلاب کا آنا ممکن ہے؟ اور وہ کونسے عوامل ہیں جو انقلاب کو لانے میں مدد کریں گے۔ اس موضوع پر بات کرنے کے لیے آج ہمارے ساتھ پروفیسر ڈاکٹر مبارک علی جو تاریخ کے اُستاد رہے ہیں اور کئی اہم کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ تو بہت شکریہ ڈاکٹر صاحب پروگرام میں آنے کا۔

مبارک علی

بلند اقبال آپ کا شکریہ کہ آپ نے مجھے اس موضوع پر بات کرنے کی دعوت دی۔ آپ نے ابن خلدون کے حوالے سے جو بات کی کہ جب کسی نظام میں دراڑیں پڑ جائیں تو اس کو تبدیل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاریخ میں تبدیلی کے دو راستے ہیں۔ ایک اصلاح کا اور دوسرا انقلاب کا۔ اصلاح کا طریقہ کار یہ ہے کہ جب زمانہ بدلتا ہے تو معاشرے کو نئے چیلنجز کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تو وہ اپنے اداروں اور اپنی روایات میں اصلاح کر کے نئے زمانے کے مطابق بناتے ہیں۔ اصلاح کے عمل میں یہ لازم ہوتا ہے کہ حکمران اور مراعات یافتہ طبقے اپنے اختیارات اور سہولتوں میں کمی کریں اور معاشرے کے دوسرے طبقوں کو شریک ہونے کا موقع دیں۔ اس کی مثال میں آپ کو انگلستان کی تاریخ سے دیتا ہوں جہاں ایک وقت میں ووٹ کا حق بہت محدود تھا۔ لیکن جب صنعتی انقلاب آیا متوسط طبقہ تیار ہوا تو برطانوی پارلیمنٹ میں 1832 کے ایکٹ کے تحت ووٹرز کی تعداد بڑھا دی گئی۔ اس لیے اگر اصلاحات کے ذریعے تبدیلی کو لایا جائے تو معاشرے کا استحکام بھی باقی رہتا ہے اور طبقاتی تصادم بھی نہیں ہوتا۔

انگلستان کے برعکس جب ہم فرانس کی تاریخ کو دیکھتے ہیں تو یہاں حکمران طبقے اپنی مراعات کو چھوڑنے پر تیار نہیں ہوتے تھے اور بدلتے ہوئے حالات میں بھی وہ پرانے اداروں اور روایات کو برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ حالانکہ فرانس کے معاشرے میں ذہنی تبدیلی کا عمل شروع ہو چکا تھا اور یہ تبدیلی لانے والے روشن خیال دور کے فلسفی اور دانش ور تھے۔ یہ فلوسوف کہلاتے تھے اور اپنی تحریروں سے لوگوں میں نئے خیالات کی جگہ بنا رہے تھے۔ ان میں والیٹر، روسو، ویدرو قابل ذکر ہیں۔ ویدرو نے دوسرے دانشوروں سے مل کر 17 جلدوں میں انسا کلو پیڈیا شائع کی۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ اُس وقت کے تمام علم کو ایک جگہ اکٹھا کر لیا جائے اور اس کے ذریعے تبدیلی کے راستوں کو کھولا جائے۔ لہٰذا 1789 میں انقلاب سے پہلے فرانس کے تعلیم یافتہ طبقے میں جس میں امراء بھی شامل تھے۔ تبدیلی کی زبردست خواہش

پیدا ہوگئی تھی۔عوام بادشاہ اور امراء کی مراعات چرچ کی مذہبی گرفت اور معاشی صورتحال سے تنگ آ چکے تھے۔لیکن فرانسیسی انقلاب کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ انقلاب بغیر کسی منصوبے کے اچانک آیا۔ 14 جولائی کا دن خاص اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اس دن پیرس کے عوام نے بیٹل کے قلعے پر حملہ کر کے جہاں سیاسی قیدیوں کو رکھا جاتا تھا اس کو مسمار کر دیا۔ جب یہ خبر فرانس کے بادشاہ کو بتائی گئی تو اس نے کہا کہ کے یہ لوگوں کی بغاوت ہے؟ تو اس پر اس کے ایک محب نے کہا کہ جناب یہ بغاوت نہیں انقلاب ہے۔ لہٰذا ایک بات تو یہ ہے کہ فرانس کا انقلاب لانے والے عام لوگ تھے۔کوئی لیڈر یا رہنما نہیں تھا۔لیکن جیسے جیسے انقلاب آگے بڑھتا گیا اسی طرح سے اسکی راہنمائی کے لیے شخصیتیں آتی گئیں۔ مثلاً ہم اس انقلاب کو 3 حصوں میں تقسیم کرتے ہیں پہلا دور وہ ہے کہ جب بادشاہت کو دستوری شکل دینے کی کوشش کی گئی۔ دوسرے دور میں بادشاہت کا خاتمہ ہوا اور اس عہد کو رین آف ٹیرر یا دہشت گردی کا زمانہ کہا گیا۔ تیسرا دور وہ ہے کہ جب نئے دستور کے تحت امن و امان کو بحال کرنے کی کوشش کی گئی۔

فرانسیسی انقلاب کی خصوصیت یہ رہی کہ انقلاب کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ اس کے راہنما بھی بدلتے رہے۔ بادشاہ اس کی ملکہ کے گلے گلوٹین کے ذریعے کاٹے گئے اور پھر خود انقلاب کے راہنما بھی اس سے نہ بچ سکے۔ ایک دوسرے پر انقلاب دشمن ہونے کے الزامات لگا کر ان کے گلے کاٹے گئے۔ ایک ایسے ہی موقع پر مرنے سے پہلے ایک انقلابی لیڈر نے کہا تھا کہ انقلاب اپنے بچوں کو نگل رہا ہے۔قتل و غارت گری کا یہ سلسلہ پیرس تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ فرانس کے دوسرے شہروں اور دیہاتوں تک بھی پہنچ گیا۔تو اس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انقلاب کبھی پر امن نہیں ہوتا۔ اس کو اپنے استحکام کے لیے اپنے مخالفوں اور دشمنوں کو اپنے راستے سے ہٹانا لازمی ہوتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ فرانسیسی انقلاب اپنے دوسرے دور میں دہشت گردی کا شکار ہوا اور یورپ کے بہت سے دانشور اس انقلاب کے حامی تھے دہشت گردی کے اس عمل سے وہ سخت مایوس ہوئے لیکن یہ دہشت گردی ایک

منطقی نتیجہ تھی جو انقلاب کو معاشرے کی نئی تشکیل دینے کے لیے ضروری تھی۔

فرانسیسی انقلاب نے دنیا کی تاریخ پر گہرے اثرات ڈالے کیونکہ اس کے ذریعے جو تبدیلیاں آئیں تھیں انہوں نے دوسرے ملکوں کو بھی متاثر کیا۔ مثلاً بادشاہت کے خاتمے کے بعد ریاست کی بنیاد دستور پر رکھی گئی۔ اور ایک اعلامیہ کے تحت شہریوں کو بنیادی حقوق دیئے گئے۔ ان شہریوں میں پہلی مرتبہ یہودیوں کو بھی شامل کیا گیا اس کے نتیجے میں قومی ریاست کی بنیاد پڑی اور قوم کی تشکیل میں ہر عقیدے، رنگ اور نسل کے لوگوں کو شامل کیا گیا۔ تعلیم جو اب تک چرچ کے ماتحت تھی اب وہ ریاست کی ذمہ داری ٹھہری، جب دوسری یورپی طاقتوں نے فرانس پر حملہ کیا تو ملک کے دفاع کے لیے عام لوگوں کی فوج تیار کی گئی۔ ایک وقت میں یہ کوشش بھی کی گئی کہ فرانس سے مذہب کا خاتمہ کر کے اس کو مکمل طور پر سیکولر بنا دیا جائے۔ اس سلسلے میں انقلابی حکومت نے نیا کلینڈر بھی بنایا تھا جس میں مہینوں کے نام بھی نئے تھے اور دس دن کا ایک ہفتہ ہوا کرتا تھا۔ لیکن انقلابی حکومت کی یہ کوشش دیرپا ثابت نہیں ہوئی لیکن اس نے جو اصلاحات کیں ان میں غلامی کا خاتمہ اور عورتوں کو حقوق دینا اس کے اہم اقدامات تھے۔

لہٰذا آج جب ہم فرانسیسی انقلاب کو یاد کرتے ہیں تو اس کے تین نعرے لوگوں میں نیا جوش اور ولولہ پیدا کرتے ہیں۔ یعنی مساوات، آزادی اور اخوت اس انقلاب نے قومی ترانہ اور قومی جھنڈے کی علامتیں بھی دیں اور آنے والے انقلابات کے لیے ایک ماڈل کی شکل بھی فراہم کی۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ یہ وہ انقلاب تھا جس نے یورپ کو ہلا کر رکھ دیا اور وہ اس انقلاب کو ختم کرنے کے لیے متحد ہوگیا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس انقلاب نے قدامت پرستی اور جدت کے درمیان تصادم کو پیدا کر کے یورپ کی سوسائٹی کو بدلا۔

بلند اقبال

فرانسیسی انقلاب کے بعد روس، چین اور کیوبا اور ویت نام کے انقلابوں کی کیا نوبت رہی؟

فرانسیسی انقلاب کے بارے میں جیسے میں بتا چکا ہوں کہ یہ انقلاب اچانک آیا۔ عوام کی راہنمائی میں آیا اور جب اس انقلاب کا خاتمہ نپولین کی آمریت سے ہوا تو اس وقت تک اس کے سارے راہنماء مارے جا چکے تھے۔

فرانسیسی انقلاب کے برعکس روسی انقلاب ایک خاص منصوبے اور نظریے کے تحت آیا لینن جو باشویک پارٹی کا لیڈر تھا وہ انقلاب کے لیے یہ ضروری سمجھتا تھا کہ اس کے لیے تربیت یافتہ نظریے کا پابند اور پرجوش انقلابیوں کی ایک جماعت ہونی چاہیے جس کی مدد سے وہ انقلاب لے کر آئے۔ انقلاب کے لیے وہ کسی وسیع بنیادوں پر سیاسی پارٹیوں کا قائل نہیں تھا۔ لینن کو یہ موقع اس وقت ملا جب پہلی جنگ عظیم میں روسی افواج کو ناکامی ہوئی اور ملک میں سیاسی اور معاشی بحران آیا۔ اس سے فائدہ اٹھا کر اس کی راہنمائی میں بالشویک پارٹی نے حکومت پر قبضہ کر کے اپنا اقتدار قائم کر لیا۔ روسی انقلاب بھی پرامن نہیں تھا اس کو بھی اپنے استحکام کے لیے خانہ جنگی میں الجھنا پڑا انقلاب دشمنوں کو راستے سے ہٹانا پڑا اور بیرونی مداخلت سے بھی تحفظ کرنا پڑا تب جا کر انقلاب کامیاب ہوا۔

روس کی طرح چینی انقلاب بھی مارکسزم کے نظریے اور ماؤ کی راہنمائی میں ایک منصوبے اور پروگرام کے تحت آیا اس انقلاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے لانے والے فیکٹری کے مزدور نہیں بلکہ دیہاتی کسان تھے۔ ماؤ کی کمیونسٹ پارٹی کو بھی اس وقت کامیابی ہوئی کہ جب جاپان نے چین پر حملہ کر دیا تو ملک کے دفاع کے لیے قوم پرست اور کمیونسٹ دونوں مل گئے۔ لیکن جب جاپان کو شکست ہوئی تو کمیونسٹوں نے قوم پرستوں کو شکست دے کر اپنی انقلابی حکومت قائم کر لی۔ یہاں بھی اقتدار میں آنے کے لیے جنگی صورتحال نے اس کی مدد کی۔

کیوبا کا انقلاب فیڈرل کاسترو اور چے گویرا کی گوریلا جنگوں کی وجہ سے وجود میں آیا اور انہیں عوام کی حمایت اس لیے ملی وہ باتستہ کی آمریت سے تنگ آ چکے تھے۔ ویت نام

کے عوام نے ہو چی من کی قیادت میں اول فرانس سے جنگیں لڑیں اور اسے شکست دی پھر امریکی فوج کی مداخلت کا مقابلہ کیا اور بالآخر اسے ویت نام سے نکال کر انقلاب کو کامیاب بنایا۔

تاریخ کے ان تمام انقلابات میں اہم بات یہ ہے کہ انہوں نے اصلاح کے ذریعے معاشرے کو درست کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ انہوں نے قدیم اداروں اور روایات کا خاتمہ کر کے ان کی جگہ وقت کی ضرورت کے تحت نئے نظام کی بنیاد ڈالی، ان انقلابات نے ماضی کی طرف نہیں دیکھا بلکہ مستقبل کے لیے منصوبوں کا تعین کیا۔ مارکسزم نظریے کے تحت آنے والے انقلاب کے تحت فلاحی ریاستوں کو قائم کیا طبقاتی تفریق ختم کی عورتوں کو برابر کے حقوق دیئے اور کوشش کی کہ انقلابات کو مستحکم بنیادوں پر قائم رکھا جائے۔ ان انقلابوں کا تنقیدی جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ ان کی کامیابیوں اور ناکامیوں پر بھی تبصرے کئے گئے ہیں۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان انقلابات نے دنیا کی تاریخ کو بدل ڈالا خاص طور سے ایشیاء اور افریقہ کے ممالک جو یورپی سامراج کے تسلط میں تھے ان انقلابات نے ان میں زندگی کی نئی روح پھونک دی جس کے زیر اثر انہوں نے اپنی آزادی کی جدوجہد کی۔

بلند اقبال

ڈاکٹر صاحب اب ہم پاکستان کی طرف آتے ہیں، کیا پاکستان کی ریاست سیاسی، معاشی اور سماجی طور پر اس قدر پس ماندہ ہوگئی ہے کہ یہاں انقلاب کے امکانات بڑھ گئے ہیں؟ اس لیے سوال یہ ہے کہ کیا پاکستان میں انقلاب آ سکتا ہے؟

مبارک علی

جب ہم پاکستان کی سیاسی، سماجی اور معاشی صورتحال کو دیکھتے ہیں تو ہمیں ریاست اور معاشرے کے تجزیہ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس وقت پاکستان کی ریاست

اپنا اعتماد اور اعتقاد کھو چکی ہے۔ اس کے ادارے جن میں نوکر شاہی، عدلیہ، پولیس وغیرہ شامل ہیں۔ یہ سب ٹوٹ، پھوٹ کا شکار ہیں سوائے فوج کے جس نے خود کو منظّم اور مستحکم کر رکھا ہے۔ لیکن ملک صرف کسی ایک ادارے کے مستحکم ہونے سے نہیں چلتے ہیں لہٰذا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ریاست اپنی بنیادی ضروریات سے ہاتھ اٹھا چکی ہے۔ اس نے تعلیم اور صحت کو تجارت بنا دیا ہے۔ بے روزگاری، بیماری، لاقانونیت، معاشرے میں پھیلی ہوئی ہے۔ ریاست کی کمزوری کی وجہ سے مختلف دہشت گرد جماعتیں اور مافیاز وجود میں آ گئے ہیں اور ریاست عوام کے تحفظ میں ناکام ہو چکی ہے۔

دوسری جانب ہم دیکھتے ہیں کہ جاگیرداری، پیر پرستی اور قبائیلی سرداری کے ادارے اپنی قدامت پرستی کے ساتھ موجود ہیں اور تمام لوگ ان کی گرفت میں جکڑے ہوئے ہیں۔ لہٰذا اس صورتحال میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ریاست اور معاشرے کی اصلاح ہوسکتی ہے۔ کیونکہ اصلاح وہ ذریعہ ہے جو ٹوٹ پھوٹ کی مرمت کرتا ہے۔ لیکن ایک فرانسیسی مفکر نے کہا تھا کہ جب صورتحال بہت بگڑ جائے تو اس صورت میں اصلاح کی کوشش ناکام ہوتی ہیں جیسے فرانس میں انقلاب سے پہلے ٹرگو (TURGOT) اور نیکر (NECKER) نے انقلاب سے پہلے فرانس کی معیشت کو بہتر بنانا چاہا مگر ان کی کوششیں ناکام ہوئیں، روس میں بھی زار کے تخت و تاج چھوڑنے کے بعد اصلاح کی کوششیں ہوئیں مگر اس میں دیر ہو چکی تھی۔ لہٰذا پاکستان کی صورتحال اس مرحلے پر ہے کہ جہاں بدعنوانیاں پھیل چکی ہیں۔ حکمران طبقوں میں ملک و قوم کی بہتری کا کوئی احساس نہیں ہے۔ ملک کا متوسط تعلیم یافتہ اور پیشہ ور طبقہ ملک چھوڑ کر روزگار کی تلاش میں دوسرے ملکوں میں جا رہا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ملک میں جگہ جگہ ویلفیئر ادارے اور چیریٹی کی سوسائٹیاں کام کر رہی ہیں۔ مگر ان کی موجودگی سے سوسائٹی تبدیل نہیں ہو رہی ہے۔ کیونکہ جب تک ریاست اور سیاسی پارٹیاں اس کی اہمیت کو نہیں سمجھیں گی۔ نظام میں تبدیلی لانا مشکل ہوگا۔

رہا یہ سوال کہ اگر اصلاح نہیں ہوسکتی ہے تو کیا تشدد اور خونریز انقلاب کے

ذریعے پرانے نظام کا خاتم کر کے نئے نظام کو قائم کرنا ہوگا۔ پاکستان کی صورتحال کا تقاضہ تو یہی ہے۔ لیکن انقلاب کے لیے کچھ شرائط ہے۔ جیسا کہ چے گویرا نے کہا تھا کہ یہ پھل خود بخود نہیں آن گرے گا۔ لہٰذا جن شرائط کی ضرورت ہے ان میں سب سے اہم یہ ہے کہ معاشرے کے دانشور اور فلسفی ذہنی تبدیلی لے کر آئیں۔ انہیں یہ احساس دلائیں کہ قدیم ادارے ناکارہ ہو چکے ہیں۔ پرانی روایات وقت کی ضروریات کو پورا نہیں کرسکتی ہیں۔ لہٰذا نئے حالات کے تحت انہیں ایک نئے نظام کا منصوبہ بنا کر پیش کرنا ہوگا۔ آخر انقلاب کی کیوں ضرورت ہے اور کیوں انقلاب ہی کے ذریعے ہمارے مسائل کا حل ہے۔

چونکہ انقلاب پرانے ادارے ختم کرتا ہے اس لیے ان کی تخلیق کا عمل ضروری ہوتا ہے۔ اس عمل کے ذریعے ایسے تخلیقی ذہنوں کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ جو وقت کی ضرورت کے تحت نیا نظام پیش کرسکیں۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ پاکستان میں نہ تو کوئی فلسفی ہے نہ ہی کوئی تخلیقی ذہن رکھنے والے دانشور اور نہ ہی وژن رکھنے والے سیاست دان اس صورت میں انقلاب کے امکانات ختم ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ کوئی ایسا انقلابی نظریہ نہیں ہے۔ جو لوگوں میں جوش ولولہ اور امید پیدا کر سکے۔ یہ مایوس کن صورتحال ہے جس سے ہم دوچار ہیں۔

بلند اقبال

ماضی میں ہم نے جو تجربات کئے ہیں اور جو مختلف نظریات سے متاثر ہوئے ہیں وہ ہمارے ذہنوں کو تبدیل کرنے میں کیوں ناکام ہوئے۔ مثلاً پاکستان میں طالب علموں اور سیاستدانوں میں روسی کمیونزم کا سیاسی اثر رہا لوگ مارکس اور لینن کو پڑھتے رہے۔ چین کے انقلاب نے ماؤ کے فلسفے کو بڑا مقبول بنایا۔ بھٹو نے سوشل ازم کا نعرہ لگایا تو دوسری جانب مذہبی جماعتیں بھی فعال رہیں۔ ضیاء الحق نے اسلامائزیشن کے عمل کو پورا کیا۔ امریکہ کی سرمایہ کاری سے بھی ہم متاثر ہوئے تو کیا ان سب نے مل کر پاکستانی سوسائٹی میں کوئی حل چل پیدا کی؟

مبارک علی

تقسیم سے پہلے ہندوستان میں روسی انقلاب سے متاثر ہونے والوں نے کمیونسٹ پارٹی قائم کی تھی۔ تقسیم کے بعد یہ پارٹی پاکستان میں بھی سرگرم عمل ہوئی مگر یہاں شروع ہی سے پابندیوں کا شکار رہی لیکن ہم جب کمیونسٹ پارٹی پر تنقید کرتے ہیں۔ تو ہمیں اس کی سب سے بڑی کمزوری یہ نظر آتی ہے کہ یہ اپنے پروگرام اپنے منصوبے اور اپنے عمل میں روس کی ہدایات پر چلتی تھی یہی صورتحال چین نواز کمیونسٹ پارٹی کی تھی، روس اور چین دونوں نے ان پارٹیوں کو اپنے مفادات کے لیے استعمال کیا مثلاً جب فاطمہ جناح اور ایوب خان کے درمیان مقابلہ تھا اور چین کی حکومت کو ایوب خان کی ضرورت تھی اس لیے اس نے یہ ہدایت کی کہ ایوب خان کی حمایت کی جائے اس پالیسی کا یہ نتیجہ ہوا کہ بائیں بازوں کی یہ جماعتیں عوام سے اپنا رشتہ نہ جوڑ سکیں اور نہ ہی عوام کا اعتماد حاصل کر سکیں۔ اب جب کہ روسی کیمونزم ختم ہو چکا ہے اور چین نے سرمایہ داری کو اختیار کر لیا ہے تو اس نئی صورتحال میں بائیں بازو کی جماعتوں اور دانشوروں کا یہ فرض ہے کہ پاکستان کی صورتحال کا تجزیہ کر کے کوئی راہ نکالیں یہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ مارکنزم کوئی آئیڈیالوجی یا عقیدہ نہیں ہے۔ یہ ایک سائنس ہے اور جسے بطور ٹول یا ہتھیار کے استعمال کر کے اپنی سوسائٹی کو سمجھنا چاہیے۔ لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ پاکستان میں بائیں بازو کی جماعتیں سمٹی ہوئی اور محدود ہیں اس کے دانشور بھی مارکنزم میں ہونے والی نئی تبدیلیوں سے پوری طرح واقف نہیں ہیں خاص طور سے لاطینی امریکہ کے ممالک میں مارکنزم کے تحت جو تبدیلیاں آ رہی ہیں۔ ان کے بارے میں ان کا علم بہت محدود ہے۔ ایک دشواری یہ بھی ہے کہ ان جماعتوں کے خلاف ریاستی پروپیگنڈا بہت گہرا ہے۔ اور ان پابندیوں کی وجہ سے انہیں کھل کر نہ تو بات کرنے کی آزادی ہے اور نا سیاسی طور پر کوئی کردار ادا کرنے کی۔

اس کے برعکس سرد جنگ کے دوران مذہبی جماعتوں کی سرپرستی کی گئی اور اب یہ سرپرستی عرب ممالک کی جانب سے ہو رہی ہے۔ جس نے ان جماعتوں کو مالی طور پر طاقتور

بنا دیا ہے۔

یہاں تک کہ ریاست بھی ان سے خوفزدہ رہتی ہے۔ اس صورتحال میں پاکستان میں اب نہ تو کوئی سخت نظریاتی کشمکش ہے اور نہ تو کوئی تصادم بلکہ مذہبی اور دائیں بازو کی جماعتیں مکمل طور پر معاشرے پر چھائی ہوئیں ہیں۔

بلند اقبال

طاہر القادری اور عمران خان جو بار بار انقلاب کی بات کرتے ہیں تو کیا واقعی یہ کوئی انقلاب لانا چاہتے ہیں یا محض نعروں کی حد تک رہیں گے؟

مبارک علی

نہیں ان غریبوں کو انقلاب کے بارے میں کچھ پتہ نہیں کہ انقلاب کیا ہوتا ہے۔ کیسے آتا ہے اور اس کے کیا نتائج نکلتے ہیں جب مذہبی لوگ انقلاب کی بات کرتے ہیں تو اس سے ان کی مراد قدیم اداروں کا احیاء ہوتی ہے۔ جیسا کہ ایرانی انقلاب میں ہوا۔ ایرانی انقلاب نے قدیم اداروں کو زندہ کرنے کی کوشش کی نئی روایات اور ادارے نہیں بنائے اس لیے یہ انقلاب ایک جگہ آ کر ٹھہر گیا۔ انقلاب کبھی بھی پرانے اداروں اور روایات کو دوبارہ سے نہیں لاتا ہے بلکہ یہ نئے ادارے بناتا ہے۔ اس لیے طاہر القادری صاحب کا انقلاب کا نعرہ اپنے اندر کوئی توانائی یا کشش نہیں رکھتا ہے اور رہے عمران خان تو یہ انقلاب کی الف ب سے بھی واقف نہیں ہمارے سیاسی رہنماؤں کے لیے ضروری ہے کہ وہ تاریخ کا مطالعہ کریں اور دنیا میں برپا ہونے والے انقلاب کا تجزیہ کریں تو انہیں اندازہ ہوگا کہ انقلاب پرامن طریقے سے نہیں آتا ہے۔ یہ قربانی مانگتا ہے اور اس میں جانوں کے نذرانے دینے پڑتے ہیں۔ دراصل سیاسی پارٹیوں اور دانشوروں کے لیے انقلاب کا نعرہ لگانا فیشن بن گیا ہے۔ کیونکہ اس لفظ میں ایک رومان ہے اور اس سے وابستہ وہ انقلابی ہیں۔ جنہوں نے ملکوں اور معاشروں کو بدلا ہے۔ اس لیے ہم اپنی روزمرہ گفتگو میں بھی انقلاب کے لفظ کو استعمال

کرتے ہیں۔ مثلاً ہر سیاسی پارٹی کا منشور انقلابی ہوتا ہے۔ انقلابی اقدامات اٹھانے کے دعوے کئے جاتے ہیں پھر شاعروں نے انقلابی نظمیں لکھ کر اور گانے والوں نے انہیں گا کر عوام کو انقلابی خوابوں میں دھکیل رکھا ہے۔

درحقیقت وہ سیاسی راہنما جو انقلاب کے نعرے لگا کر عوام کو دھوکے اور فریب میں مبتلا کئے ہوئے ہیں ان کے خلاف لکھنے کی ضرورت ہے۔ تا کہ لوگ اس فریب سے نکل کر حقیقت کی جانب آئیں۔

بلند اقبال

ڈاکٹر صاحب مذہبی جماعتیں جو احیاء کی بات کرتیں ہیں۔ اگر ماضی کے نظام کو واپس لایا جائے تو یہ نظام بھی کسی نہ کسی فرقے کے عقیدے کے مطابق ہوگا۔ تو اس سلسلے میں سوسائٹی بٹی ہوئی رہے گی اور متحد نہیں ہوگی۔ تو میرا سوال یہ ہے کہ کیا ہمارے مسائل کا یہ کوئی حل ہے؟

مبارک علی

آپ نے جو سوال کیا ہے تو اس میں یہ ہے کہ اوّل تو احیاء کی تحریکیں انقلابی نہیں ہوتیں ہیں۔ اور اب تک تاریخ میں ایسا نہیں ہوا ہے کہ ماضی اس کی پرانی شکل میں واپس لایا جاسکے۔ نمبر 2 چونکہ ہر مذہب فرقوں میں بٹا ہوا ہے اس لیے جو فرقہ بھی طاقت میں آئے گا وہ تشدد کے ساتھ دسرے فرقوں کو مجبور کرے گا کہ اس کے دائرے میں آئیں اس کے نتیجے میں فسادات ہونگے اور معاشرہ انتشار کا شکار ہوگا۔

بلند اقبال

ڈاکٹر صاحب یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ آخر لوگ کیوں انقلاب چاہتے ہیں؟

مبارک علی

لوگ اس لیے انقلاب چاہتے ہیں کیونکہ انکے ذہن میں انقلاب کا یہ توڑ ہے کہ یہ امیر غریب کے فرق کو مٹائے گا۔ بے روزگاری ختم کرے گا بنیادی ضرورتوں کو پورا کرے گا۔ عوام کو تعلیم اور صحت کی ضمانت دے گا۔ اس لیے لوگ یہ توقعات رکھتے ہوئے انقلاب چاہتے ہیں اور ان سیاسی لیڈروں کے حامی ہوتے ہیں جو یہ خوبصورت نعرے لگاتے ہیں۔

بلند اقبال

یہاں میرا سوال ایک اور ہے کہ کیا ہمارے عوام کی ذہنی سطح فرانس، روس اور چین کے عوام کی مانند ہے اور کیا یہ اتنے ہی باشعور ہیں کہ انقلاب لانے کے لیے تیار ہو جائیں؟

مبارک علی

نہیں میرا خیال یہ ہے کہ ہمارے عوام اس قدر باشعور نہیں ہیں کہ اس صورتحال کو سمجھ سکیں۔ کیونکہ ہمارے ہاں ابھی تک جاگیرداری، سجادہ نشینوں اور قبائلی سرداروں کا اثر و رسوخ ہے۔اس سماج میں جہاں پنچائتیں یہ فیصلہ کریں کہ کسی ایک فرد کے جرم پر اس کی بہن کے ساتھ گینگ ریپ کیا جائے تو یہ سوسائٹی ابھی بہت پسماندہ ہے۔ اور یہ پسماندگی اس صورت میں دور ہوسکتی ہے کہ جب غربت کا خاتمہ ہو اور تعلیم کی سہولتیں ہوں لیکن وہ تعلیم جو ذہنی طور پر پسماندہ نہیں بنائے بلکہ روشن خیالی کو پیدا کرے۔ لیکن ہمارے موجودہ ادارے پسماندگی کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں اس کو ختم کرنا نہیں۔ ان حالات میں دور دور تک کسی مثبت تبدیلی کے آثار نظر نہیں آتے ہیں۔ مگر جہاں حالات مایوس کرتے ہیں۔ وہیں تاریخ حوصلہ دیتی ہے کہ زمانہ ٹھہرا ہوا نہیں رہتا ہے۔ یہ کبھی انسانی خواہشات کے ساتھ بدلتا ہے اور کبھی ان کے خلاف تبدیلی کا یہ عمل شائد ہماری پسماندہ اور ٹھہری ہوئی زندگی میں کوئی حل چل پیدا ہو۔

بلند اقبال

ڈاکٹر صاحب جب تبدیلی کی بات کی جائے تو کیا ہم پاکستان میں ترکی کے تجربے سے کچھ سیکھ سکتے ہیں مزید یہ کہ اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے کہ اگر پاکستان میں کوئی تبدیلی آئے تو کیا یہ ارتقائی ہوگی۔ اور کیا عالمی صورتحال میں بیرونی دباؤ سے بھی تبدیلی کے امکانات ہوں گے؟

مبارک علی

آپ نے بڑا مشکل سوال کیا ہے کیونکہ مورخ کا کام ماضی کا تجزیہ کرنا ہوتا ہے نہ کے مستقبل کے بارے میں کوئی پیشین گوئی کرنا، لیکن یہ ضروری ہے کہ موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ آنے والے وقتوں میں کیا صورتحال ہوگی۔ لیکن سب سے پہلے میں یہ وضاحت کرنا چاہوں گا کہ پاکستان نے سیاست میں بہت تجربات کئے ہیں۔ ہم نے آمرانہ طرز حکومت کا بھی تجربہ کیا ہے۔ بنیادی جمہوریتوں کو بھی آزمایا ہے اور پارلیمانی جمہوریوں سے بھی سیکھنے کی کوشش کی ہے۔ اور صدارتی نظام کو بھی آزمایا ہے۔ لیکن ہمارے یہ تمام تجربات ناکام ہوئے ہیں۔ جب جمہوریت آتی ہے تو اس کے ساتھ نااہل اور بدعنوان سیاستدان آتے ہیں۔ جبکہ ان کی جگہ فوجی آمریت آتی ہے۔ تو لوگوں کے بنیادی حقوق صلب ہو جاتے ہیں یہ ایسی ہی صورتحال ہے جیسی کہ قدیم یونان میں تھی جب وہاں آمر آتا تو اس کے پاس تمام اختیارات ہوتے تھے۔ جب اس کی جگہ چند سری (Oligarchy) آتی تو اختیارات چند افراد میں تقسیم ہو جاتے تھے جس کا نتیجہ انتشار ہوتا تھا۔ اس سے بے زار ہو کر جب جمہوریت آتی تھی۔ تو یہ مزید کنفوژن پیدا کرتی تھی۔ عوام تینوں نظاموں سے متاثر نہیں تھے اور ان کی گردش میں چھٹکارے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ پاکستان میں بھی عوام جمہوریت اور آمریت کی گرفت میں ہیں اور دونوں میں نجات کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

ہم پاکستان کی تاریخ کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں ایک 1947 سے 1970 تک کا پاکستان اور دوسرا بنگلہ دیش کی آزادی کے بعد کا پاکستان۔ پاکستان کے پہلے حصے میں آمرانہ حکومتوں نے سیاسی اور سماجی اداروں کو اپنے حق میں تشکیل دے کر انہیں عوام کی فلاح و بہبود سے کاٹ دیا تھا۔ پاکستان کے دوسرے حصے میں پیپلز پارٹی کی حکومت نے اوّل ریاست کو مذہبی بنایا اور اسلامائزیشن کے عمل کو ضیا الحق نے مکمل کیا۔ اس لیے اس عہد میں مذہبی فرقوں کے درمیان تفادات پوری شدت کے ساتھ ابھرے جس میں فسادات اور خونریزی نے معاشرے میں مذہبی تاثرات کو پوری طرح ہوا دی۔ اسی نے آگے چل کر مذہبی انتہاء پسندی کو پیدا کیا۔ اب یہ مذہبی فرقے کسی نہ کسی شکل میں ریاست پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ تاکہ اس کے بعد ریاست کے اداروں کی مدد سے اپنے عقیدے کی تبلیغ کریں۔

اب آپ نے جو یہ سوالات کئے ہیں کہ ان حالات میں کیا کوئی ایسا راستہ ہے جو اس پسماندگی کو دور کر سکے۔ آپ نے ترکی کے ماڈل کا ذکر کیا۔ ایک تو کسی دوسرے ملک کے ماڈل کو اختیار نہیں کیا جا سکتا ہے کیونکہ وہ اس کے اپنے حالات کی پیداوار ہوتا ہے۔ ترکی میں فوج نے یورپی طاقتوں کی خلاف اپنے ملک کا دفاع کیا تھا اور ملک کو ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے بچایا تھا اس لیے ترک عوام میں اس کی عزت و احترام تھا۔ ہمارے ہاں یہ صورتحال نہیں ہے۔ دوسری بات آپ نے میڈیا کی کی۔ یقیناً میڈیا ایک بڑی طاقت ہے لیکن اس کا انحصار اس پر ہے کہ اسے کس کے لیے استعمال کیا جائے ترقی کے لیے یا پسماندگی کے لئے۔ پاکستان میں اس کا کردار منفی ہے۔ یہ سوسائٹی کو مزید پسماندہ بنا رہا ہے۔ اس کے ذریعے کسی مثبت تبدیلی کے کوئی امکانات نہیں ہیں۔ آپ نے جو عالمی دباؤ کا ذکر کیا تو اس کی اپنی اہمیت ہے کیونکہ جب انسانی حقوق کی پامالی ہوتی ہے یا اقلیتوں کے ساتھ ناروا سلوک ہوتا ہے تو عالمی میڈیا آواز اٹھاتا ہے اور اس کے اثر سے ہمارے حکمران ان مسائل پر توجہ دیتے ہیں۔ لیکن یہ بیرونی دباؤ مکمل تبدیلی لانے میں موثر ثابت نہیں ہو رہا ہے۔ اب رہا آپ کا یہ سوال کہ کیا ارتقائی طور پر تبدیلی آ سکتی ہے۔ تو اس کا جواب یہی ہے کہ اگر تبدیلی کے ایجنٹس

(Agents) متحرک ہوں اور ایسی جماعتیں اور گروپس ہوں جو سیاسی اور سماجی سرگرمیوں کے زیرِاثر معاشرے کو تبدیل کرنا چاہتے ہیں تو اس کے امکانات ضرور ہیں۔ مگر یہاں بھی یہ کہنا چاہوں گا کہ ہمارے پاس ایسے روشن خیال ذہنوں کی بہت کمی ہے۔

بلند اقبال

ڈاکٹر صاحب ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ پاکستان میں اس وقت ایک جانب سعودی عرب اور ایران اثر انداز ہو رہے ہیں تو دوسری طرف ہم افغانستان کے مسائل میں الجھے ہوئے ہیں تیسری جانب امریکہ اور چین کے درمیان اپنے مفادات کو ڈھونڈ رہے ہیں تو یہ ایک ایسی صورتحال ہے کہ جو ہمیں مزید مسائل میں اُلجھا رہی ہے۔ کیا اس سے نکلنے کا کوئی راستہ ہے؟

مبارک علی

سعودی عرب اور دوسرے عرب ملکوں کے ساتھ ہمارے تعلقات میں مالی مفادات کا بڑا حصہ ہے۔ اور سعودی عرب اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے برانڈ کے مذہب کو ہمارے ہاں روشناس کرا رہا ہے۔ دوسری جانب پاکستان کی شیعہ کمیونٹی اپنے تحفظ کے لیے ایران کی جانب دیکھ رہی ہے۔ اس صورتحال کی وجہ سے فرقے وارانہ فسادات ہو رہے ہیں۔ اب یہ ہمارے حکمران طبقوں کا فرض ہے کہ وہ اس صورتحال پر قابو پائیں ورنہ یہ آگے چل کر مزید فرقے وارانہ فسادات کا باعث ہوگا۔ اور ہمیں اس حقیقت کو بھی تسلیم کر لینا چاہیے کہ افغانستان کے معاملات میں دخل اندازی کر کے ہمیں نقصانات ہوئے ہیں۔ ہمارے سامنے سری لنکا کی مثال موجود ہے جس نے تامل ٹائیگر کے خاتمے کے بعد مستحکم جمہوریت قائم کر لی ہے۔ جس نے فرقے وارانہ اور نسلی تعصب کو تقریباً ختم کر دیا ہے۔ ہمارے سامنے بنگلہ دیش کی مثال بھی موجود ہے جس نے ریاست کو سیکولر بنا کر ہندوستان سے اچھے تعلقات قائم کئے ہیں۔ لہٰذا ہمارے لیے بھی یہ لازم ہے کہ ہمسائیوں سے خوشگوار

تعلقات رکھیں۔فوجی اخراجات کم کر کے بیرونی قرضوں سے نجات حاصل کریں اورعوام کی فلاح و بہبود کے لیے اپنے وسائل استعمال کریں۔

بلند اقبال

میں اپنے ہر پروگرام میں یہ کوشش کرتا ہوں کہ کسی خاص لفظ یا جملے کے ذریعے جسے میں پاس ورڈ کہتا ہوں پروگرام کی وضاحت ہو سکے۔اس پروگرام میں ڈاکٹر مبارک علی سے جو گفتگو ہوئی اس کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ پاکستان کو یقیناً ایک تبدیلی کے لیے انقلاب کی ضرورت ہے۔لیکن یہ ذہنی اور علمی انقلاب ہونا چاہیے جو لوگوں میں شعور کو پیدا کرے تاکہ لوگ مذہب کے نام پر قوم پرستی اور حب الوطنی کے نام پر مشتعل نہ ہوں اور حالات کا تجزیہ کر کے اپنی راہ کا تعین کر سکیں۔میں ڈاکٹر مبارک علی صاحب کا مشکور ہوں کہ جنہوں نے وقت دیا اور اس موضوع پر سیر حاصل گفتگو کی۔

☆......☆......☆

5- عقیدہ اور علم، محبت اور نفرت کے درمیان رشتہ

بلند اقبال

آج ہم جس موضوع پر گفتگو کریں گے وہ عقیدے اور علم کے درمیان رشتہ ہے۔ یہ ایک اہم موضوع ہے جس پر اہم فلسفی، دانشور اور مذہبی رہنماؤں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ جس میں حضرت عیسیٰؑ سے لے کر خلیل جبران تک شامل ہیں۔ عقیدے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کی کوئی عقلی بنیاد نہیں ہوتی۔ اس پر محض ایمان لانا ہوتا ہے جبکہ اس کے مقابلے میں علم کا تعلق عقل اور دلیل سے ہوتا ہے اس لحاظ سے دونوں ایک دوسرے سے بہت دور ہیں اور یوں کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ان کے درمیان محبت اور نفرت کے رشتے ہیں۔ اس موضوع کو سمجھنے کے لیے ہمیں تاریخ سے مدد لینی ہوگی۔ عیسائی مذہب نے اس رشتے کو کس طرح سے دیکھا اور سمجھا ہے اور اسلام نے سائنس اور مذہب کے درمیان کس طرح سے توازن کو قائم رکھا۔ کیونکہ یہ ایک اہم موضوع ہے اس لیے اس پر گفتگو کرنے کے لیے آج ہمارے درمیان ڈاکٹر مبارک علی موجود ہیں۔

مبارک علی

یہ ایک بہت اہم موضوع ہے خاص طور سے آج کل کے حالات میں جبکہ ایک جانب عقیدہ اپنی ٹھوس بنیادوں پر قائم ہے اور دوسری جانب علم کا پھیلاؤ ہے۔ جو انکشافات کے ذریعے اس پوری کائنات کو ہمارے سامنے لا رہا ہے۔ یہاں میں چاہوں گا کہ سب سے

پہلے عقیدے اور علم میں فرق واضح کر دوں تا کہ بحث کرتے وقت ہم اس فرق کو ذہن میں رکھیں اور دونوں کے کردار ان کے عمل اور ان کے اثرات کا جائزہ لے سکیں۔ جب ہم عقیدے کی بات کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم صرف ایک سچائی کو مانتے ہیں اور دوسری سچائیوں کو تسلیم نہیں کرتے ہیں۔ عقیدے پر ایمان لایا جاتا ہے اسے بغیر کسی ترکیب یا چیلنج کے تسلیم کر لیا جاتا ہے اس میں ذرا بھی شک و شبہ ایمان کی کمزوری بن جاتا ہے۔ اس لیے عقیدے پر یقین رکھنے والا خود کو صاحب ایمان اور دوسروں کو گمراہ سمجھتا ہے۔ اس کے مقابلے میں علم کا مطلب ہے جاننا۔ جاننے کے لیے ضروری ہے کہ تحقیق کی جائے، کھوج لگائی جائے، اور جب تک کوئی دلیل نہ ہو اسے قبول نہ کیا جائے۔ اس کے نتیجے میں علم کے ذریعے دریافت ہونے والا علم برابر بدلتا رہتا ہے۔ جب نئی تحقیق آتی ہے۔ نئے شواہد آتے ہیں تو اس کے ساتھ ہی سچائی بھی بدل جاتی ہے۔ اس لیے اگر عقیدے پر ایمان رکھا جائے تو آپ ایک جگہ رک جائیں گے آگے نہیں بڑھیں گے۔ کیونکہ اس میں کسی اور سچائی کی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن علم نئے خیالات اور افکار سائنس اور ٹیکنالوجی کے ذریعے دنیا کو آگے بڑھاتا رہتا ہے۔ ذہن کی آبیاری کرتا ہے تعصّبات مٹاتا ہے اور نفرتوں کا خاتمہ کرتا ہے۔ آج کے دور میں عقیدہ ایک جگہ ٹھہرا ہوا ہے جب کہ علم کے پھیلاؤ نے پوری دنیا کو سمیٹ لیا ہے۔ یہاں میں ایک وضاحت اور کر دوں کہ عقیدے پر ایمان رکھنے والے اپنی جگہ مطمئن اور پُرسکون ہوتے ہیں لیکن اہل علم جاننے کی جستجو میں ذہنی پریشانیوں میں مبتلا رہتے ہیں۔ مگر ذہنی طور پر متحرک ہونا دنیا کو تبدیل کرنا ہے۔

یہاں میں یہ ذکر بھی کرتا چلوں کہ قدیم یونان میں اپالو کے مندر کے دروازے پر یہ لکھا ہوا تھا کہ Know The Self یعنی اپنے آپ کو پہچانو۔ یہ ایک بڑا اہم جملہ تھا کہ انسان کو جاننے کی ابتداء خود سے کرنا چاہیے اور پھر اس دنیا اور کائنات کو جاننے کے لیے آگے بڑھنا چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ یہ جملہ علم کی افضلیت کو قائم کرتا ہے۔

بلند اقبال

ڈاکٹر صاحب یہاں میں یہ سوال کرنا چاہوں گا کہ کیا یہ درست ہے کہ عقیدہ خود علم کی پیداوار ہوتا ہے اور پھر آگے چل کر ان کے باہمی رشتوں میں تبدیلی آتی ہے۔

مبارک علی

آپ کی بات یہاں تک تو درست ہے کہ علم عقیدے کو ایک مفروضے کے طور پر سامنے لاتا ہے۔ لیکن اس کے بعد عقیدہ اپنی انفرادی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ اور علم کو زیر تسلط لا کر مجبور کرتا ہے کہ وہ اس کی حقانیت کو بغیر کسی تجزیے اور تنقید کے تسلیم کرے۔

عقیدے کے اس تسلط کو کبھی ریاست اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتی ہے تا کہ اس کے ذریعے اس کے ماننے والوں کو متحد رکھے۔ ریاست کے تحفظ کے لیے عقیدے کے نام پر قربانی کے لیے تیار کرے۔ حکمران طبقے اپنی مراعات کو محفوظ رکھیں کبھی سوسائٹی عقیدے کے تحفظ کے لیے جذباتی ہو جاتی ہے اور کسی بھی صورت اس پر تنقید برداشت نہیں کرتی ہے۔

عہدِ وسطیٰ میں جب یورپ میں چرچ کا غلبہ تھا تو تمام علوم عیسائی عقیدے کو سچا ثابت کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ارسطو کے فلسفے کو بھی عیسائی عقیدے میں ڈھال لیا گیا تھا۔ اسلامی معاشرے میں بھی علم کلام نے فلسفے کی جگہ لے کر عقیدے کی حمایت کی لہٰذا جب عقیدے کا تسلط ہو تو دوسرے علوم یا تو اس کے ماتحت ہو جاتے ہیں یا ان کی ترقی رک جاتی ہے۔

بلند اقبال

ڈاکٹر صاحب زرا اس کی وضاحت کریں کہ 750 عیسوی میں وہ کیا وجوہات تھیں کہ اسلامی سوسائٹی عقیدے کے تسلط سے آزاد ہوئی اور فلسفے اور سائنس میں ترقی کی؟

مبارک علی

آپ نے اسلامی معاشرے میں علمی کارناموں کے بارے میں جو سوال کیا ہے تو مورخین 750 عیسوی سے لے کر 1258 عیسوی تک۔ جبکہ منگولوں کے ہاتھوں بغداد تباہ و برباد ہوا تو اسے سنہری دور سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس عہد کی اوّل خصوصیت تو یہ ہے کہ عباسی خاندان نے فتوحات کے ذریعے ایک بڑی سلطنت قائم کی۔ اس کے نتیجے میں جو غیر عرب اقوام سلطنت کا حصہ بنیں وہ اپنے ساتھ اپنی تہذیب اور کلچر کو بھی لے کر آئیں جس سے اسلامی معاشرے کو فائدہ پہنچا دوسری اہم دریافت جو اس دور میں ہوئی وہ 750 عیسوی میں عربوں نے چینیوں سے کاغذ بنانا سیکھا جس کا پہلا کارخانہ بغداد میں قائم ہوا۔ کاغذ کی ایجاد نے علمی تحریروں کو تیزی سے لوگوں تک پہنچایا۔ تیسرا اہم قدم ہارون رشید نے اس وقت اٹھایا۔ جب اس نے دارالحکمت کے نام سے ایک علمی ادارہ بغداد میں قائم کیا جس میں مسلمانوں کے علاوہ یہودی، عیسائی، مجوسی (یعنی زرتشت کے ماننے والے) اور ہندو علما کو ملازم رکھا جنہوں نے نہ صرف یونانی فلسفے کے تراجم کئے بلکہ ریاضی، ایسٹرو نامی اور ایسٹرولوجی پر تجربے کئے مامون نے اقتدار میں آنے کے بعد ایک رسد گاہ تعمیر کرائی۔ ان علمی اور سائنسی سرگرمیوں کی وجہ سے مسلم دنیا میں علمی میدان میں ترقی ہوئی۔ مصر میں فاطمی خلانہ الحاکم نے بھی دارالحکمت قائم کیا۔ اس عہد کا ایک مشہور سائنسدان ابن ہیثم ہے۔ جنہوں نے آنکھ اور اس کی بینائی پر کام کیا۔ الخوارزمی نے ریاضی میں ہندوستانی علماء سے علم ہندسہ سیکھا جس میں صفر کی ایجاد بھی شامل ہے جو براستہ اندلس یورپ پہنچا۔ یہاں یہ ذکر کرنا ضروری ہے کہ سائنس کی ان سرگرمیوں نے کیونکہ عقیدے پر حملہ نہیں کیا اس لیے ان کے خلاف علماء کا ردعمل نظر نہیں آتا ہے۔

بلند اقبال

یہاں ڈاکٹر صاحب میں یہ سوال کرنا چاہوں گا کہ فلسفے اور عقیدے کے درمیان

تصادم کی ابتداء کب ہوئی ؟

مبارک علی

اس کی ابتداء یونانی فلسفے کے ترجموں سے شروع ہوئی جس سے متاثر ہوکر مامون کے عہد میں معتزلہ کا فرقہ وجود میں آیا جنہوں نے مذہبی عقائد کو ناقدانہ نظر سے دیکھا۔ان کا علماء سے تصادم خلق قرآن کے نظریے پر ہوا۔ان کا کہنا تھا کہ دوسری مخلوق کی طرح قرآن بھی خلق ہوا ہے۔جس کا مطلب یہ تھا کہ دوسری مخلوق کی طرح یہ بھی زوال پذیر ہوسکتا ہے (نعوذ باللہ) معتزلہ کے عالموں نے اخوان صفہ یعنی رسالوں میں اپنے فلسفیانہ خیالات بھی تحریر کئے،لیکن مامون کی وفات کے بعد معتزلہ کی سرپرستی نہیں ہوئی اور وہ گمنامی میں چلے گئے۔

اسلامی معاشرے میں فلسفے کے خلاف ابتداء ہی سے مخالفت کا ردعمل رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فلسفہ شک وشبہات کو پیدا کرتا ہے سوالات کو اٹھاتا ہے۔اور عقیدے پر جو ایمان ہے اس کو متزلزل کرتا ہے۔اس لیے ہمیں اسلامی تاریخ میں چند فلسفیوں کے نام ملتے ہیں جن میں کندی، رازی، ابن سینا، اور ابن رُشد شامل ہیں۔جنہیں عقیدے کی مخالفت کی وجہ سے ایک جانب کر دیا گیا ہے۔غزالی نے فلسفے کے خلاف مہتمامت افلسفہ نامی کتاب لکھ کر اس پر سخت تنقید کی ہے۔

فلسفے کی یہ مخالفت دینی مدارس کے نصابوں میں بھی ہے جہاں فلسفے کا مضمون شامل نہیں ہے۔مثلاً درس نظامیہ اور مدارسِ دیوبند کے نصاب میں فلسفے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ علامہ اقبال جنہیں فلسفی بھی کہا جاتا ہے۔انہوں نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے کہ مسلمانوں کو فلسفہ اور ادب نہیں پڑھنا چاہیے۔یہی وجہ ہے کہ آج بھی پوری مسلم دنیا میں ہمیں کوئی فلسفی نظر نہیں آتا ہے۔فلسفے کی اس غیر موجودگی کی وجہ سے مسلمان معاشرے میں عقیدے کا تسلط قائم ہے۔

بلند اقبال

ڈاکٹر صاحب یہ بتائیے گا کہ فلسفے اور سائنس میں عربوں سے زیادہ ایرانیوں کا حصہ ہے۔ اور ساتھ ہی میں یہودی اور عیسائی عالموں نے بھی علمی ترقی میں اہم کردار ادا کیا ہے؟

مبارک علی

یہ بات ایک حد تک درست ہے کیونکہ جب ہم عباسی خلافت اور اس کے پھیلاؤ کو دیکھتے ہیں تو ہمیں واضح طور پر نظر آتا ہے کہ ایران کی فتح کے بعد اسلامی معاشرے میں ایک ذہنی انقلاب آیا۔ کیونکہ صدیوں پرانی ایرانی تہذیب اپنے اندر علمی خزانے رکھتی تھی جس کے وارث علماء تھے۔ چنانچہ البیرونی، ابن سینا، ابوبکر راضی، فخر الدین راضی، عمر بن خیام ان سب کا تعلق ایران اور وسط ایشیاء سے تھا اور انہوں نے علم کو عقیدے پر ترجیح دی اور نئے خیالات و افکار کو جنم دیا۔ اس علمی تحریک کے خاتمے کے ذمہ دار امام غزالی تھے جن کا تعلق اشعری فرقے سے تھا۔ انہوں نے فکر کے تمام دروازے بند کر کے عقیدے کی بالا دستی کو مستحکم کر دیا۔

بلند اقبال

ڈاکٹر صاحب یہاں میں آپ سے یہ سوال کرنا چاہوں گا کہ یونانی فلسفے نے کیونکر اسلامی معاشرے کو متاثر کیا؟

ڈاکٹر مبارک صاحب

جی یونانی فلسفے کی مختصر تاریخ بیان کرتے ہوئے یہ وضاحت کرنا چاہوں گا کہ ہم اسے دو ادوار میں تقسیم کرتے ہیں۔ پہلا دور ایونیا کے فلسفیوں کا ہے جنہوں نے کائنات کی

تخلیق پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ان ہی میں سے ایک فلسفی ہیرک لائٹس (Herik Litus) کا کہنا تھا کہ دنیا برابر بدلتی رہتی ہے۔ ہر چیز متحرک ہے اس لیے سچائی بھی مطلق نہیں ہے۔اور بار بار نئے روپ میں آتی ہے۔ یونانی فلسفے کا دوسرا دور سقراط، افلاطون اور ارسطو کا ہے جنہوں نے انسانی فطرت اس کے ذہن اس کے کرداراوراعمال کا مطالعہ کیا۔ یونان میں فلسفی کی تعلیم ارسطو کی اکیڈمی میں بازطینی عہد تک جاری رہی لیکن جب رومی سلطنت عیسائی ہوئی تو فلسفے کی جگہ عقیدے نے لے لی۔ غیر عیسائی فلسفے کے خلاف سخت مہم کا آغاز ہوا جس کی وجہ سے وہ رومی سلطنت چھوڑ کر جلاوطن ہوئے۔اسکندریہ کی مشہور خاتون فلسفی کو پتھر مار مار کر ہلاک کیا گیا اور پھراس کی لاش کو جلایا کہ یہ غیر عیسائی فلسفی عراق کے ایک شہر حنان میں آ کر آباد ہوئے اورانہوں نے یہاں یونانی فلسفے کواسلامی معاشرے سے روشناس کرایا۔لیکن جیسا کہ ہم نے دیکھا کہ اس فلسفے نے ایک محدود وقت میں ایک محدود طبقے کوتو متاثر کیا لیکن معاشرے کی اکثریت عقیدے کی پیروکار رہی۔

بلند اقبال

ڈاکٹر صاحب میں یہ معلوم کرنا چاہوں گا کہ عقیدے اورعلم کا تصادم یورپ میں کیسے ہوااوراس کے کیا نتائج برآمد ہوئے؟

مبارک علی

عیسائی تسلط ہونے کے بعد یورپ میں چرچ کا اثر ورسوخ بڑھ گیا تھا۔ سیاست ہو، تعلیم ہو یا روزمرہ کے معاملات ہوں، یہ سب چرچ کی نگرانی میں تھے۔ چرچ کے ایک مشہور عالم تھامس اکیوناس نے ارسطو کے فلسفے کوعیسائیت میں ڈھال کر اسے عقیدے کا محافظ بنا دیا تھا۔ فلسفے کا کام عقیدے کوچیلنج کرنا نہیں بلکہ اسے مستحکم کرنا تھا۔عقیدے کے خلاف کسی بھی قسم کے افکار وخیالات کوروکنے کے لیے چرچ نے انکلویشن یا مذہبی عدالت کا ادارہ قائم کیا تھا۔جس کے عہدے داروں کا کام یہ تھا کہ وہ شہر شہر گاؤں گاؤں جا کر ایسے

افراد کو تلاش کرتے تھے جو عقیدے سے منحرف ہوتے تھے۔ پھر ان پر مقدمہ چلایا جاتا تھا انہیں اذیت دی جاتی تھی ان سے اپنے گناہوں کا اعتراف کرایا جاتا تھا اور جرم ثابت ہونے پر انہیں زندہ جلایا جاتا تھا۔

ایک سوال کے جس نے عقیدے اور علم میں تصادم پیدا کیا کہ کیا زمین گھومتی ہے اور سورج ساکن ہے۔ کیونکہ مذہبی عقیدے میں زمین کا ساکن ہونا طے تھا جس کے گرد سورج گھومتا تھا۔ اس لیے جب کوپرنیکس، کیپلر، برونو اور گلیلیو نے زمین کے ساکت ہونے سے انکار کیا تو چرچ کا ان کے خلاف سخت ردعمل تھا۔ کوپرنیکس اور کیپلر تو چرچ کے عذاب سے بچ گئے، مگر برونو کو اس جرم کی سزا میں زندہ جلایا گیا۔ گلیلیو پر مقدمہ چلایا گیا اُسے اذیت دی گئی اور اسے مجبور کیا کہ وہ اپنی غلطی کو تسلیم کرے چنانچہ اس نے معافی مانگ کر جان چھڑائی اور بقیہ زندگی اپنے گھر میں قید رہ کر گزاری، خاص بات یہ ہے کہ تاریخ میں ان سائنس دانوں کو جنہوں نے اپنے زندگیوں میں اذیتیں اٹھائیں۔ عذاب سہے انہیں درست ثابت کیا اور انکے علم کی بنیاد پر دنیا آگے کی جانب بڑھی کہ جب سائنسی تحقیقات نے یہ ثابت کر دیا کہ زمین گھومتی ہے سورج ساکت ہے اور خلاء میں دوسری بہت سے سیارے اور کہکشائیں ہیں تو چرچ کو بھی اس بات کا احساس ہوا کہ اپنی اس غلطی کو تسلیم کرے۔ چنانچہ 1992 میں پوپ جان پال نے گلیلیو کے مقدمے کا ازسرنو جائزہ لے کر یہ اعلان کیا کہ گلیلیو کو جو سزا دی گئی وہ غلط تھی اس کا یہ اعلان ایک لحاظ سے عقیدے پر علم کی فتح ہے۔ لیکن جیسا کہ ایک تاریخ دان نے یہ سوال کیا تھا کہ کیا چرچ برونو اور دوسرے سائنسدانوں اور عالموں کو جو سزائیں دی تھیں اور انہیں زندہ جلایا گیا تھا کیا وہ ان کے بارے میں اپنی غلطیوں کا اعتراف ایک ایک کر کے کرے گا اور ان کے یہ مقدمات ویٹی کن کے آرکائیو میں محفوظ رہیں گے۔

بلند اقبال

ڈاکٹر صاحب یہاں پر میں یہ سوال کرنا چاہوں گا کہ ڈارون کے نظریہ ارتقاء نے

عقیدے کے تسلط کو توڑا اور سائنس کی بالا دستی کو قائم کیا۔ عقیدے اور علم کے درمیان یہ تصادم براہ راست تھا جس کے انسانی معاشرے پر گہرے اثرات ہوئے؟

مبارک علی

مذہب اور سائنس کا زبردست ٹکراؤ اس وقت ہوا جب سائنس نے تخلیق کے عقیدے کو چیلنج کیا۔ بائبل کے مطابق خدا نے اس دنیا کو سات دن میں مکمل کیا۔ ایک شخص نے تو یقینی طور پر زمین کی مدد کو بھی بائبل کی بنیاد پر متعین کرتے ہوئے کہا کہ یہ ولادت اکتوبر کو چھ ہزار سال قبل تخلیق ہوئی۔ تخلیق کے مقابلے میں ارتقاء کا نظریہ تھا۔ جس پر کچھ سائنس دان اظہار خیال کر چکے تھے لیکن اس کو ٹھوس سائنسی بنیادوں پر ڈارون نے اپنی کتاب "Origan of the Species" میں ثابت کیا۔ یہ کتاب 1859 میں شائع ہوئی تو تین ہفتوں کے اندر اندر اس کی بیس ہزار کاپیاں فروخت ہوئیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ لوگوں میں ارتقاء کے بارے میں جاننے کا گہرا شوق تھا۔ ڈارون نے اپنی اس کتاب میں انسانی ارتقاء کے مختلف مراحل کا ذکر کیا ہے۔ جو افریقہ کے براعظم میں مکمل ہوئے یہ مراحل اس طرح سے ہیں۔ ہومو ہوموند (Homo Hominid) ہومو ہوبین (Homo Hobilis)، ہومو ایکریکٹس (Homo Erectus) اور ہومیو سیپین (Homo Sapiens) افریقہ سے انسان دنیا کے مختلف خطوں میں پھیلا

چونکہ ارتقاء کے نظریے نے تخلیق کے عقیدے پر کاری ضرب لگائی تھی اس لیے مذہبی حلقوں میں اس کے خلاف سخت ردعمل ہوا۔ لیکن سائنسدانوں نے اس کی بنیادوں کو تجربات اور شواہد کی روشنی میں ناقابل تسخیر بنا دیا۔ یہ مخالفت آج تک جاری ہے۔ مثلاً امریکہ کی کچھ ریاستوں میں یہ نصاب کا حصہ نہیں ہے۔ یہی صورتحال اسلامی معاشرے میں ہے۔ لیکن اس کا انسانی تہذیب پر گہرا اثر ہوا۔ آثار قدیمہ اور تاریخ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ کوئی بھی ادارہ روایات اور تہذیب و تمدن کبھی بھی مکمل شکل میں وجود میں نہیں آتے ہیں۔ بلکہ یہ سب ارتقاء کے مرحلوں سے گزرتے رہتے ہیں۔ اور ارتقائی عمل ٹھہرتا نہیں ہے بلکہ

ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ جس کی وجہ سے دنیا ہر لمحہ بدلتی رہتی ہے۔

بلند اقبال

ڈاکٹر صاحب یہ کہاں تک درست ہے کہ اگر سائنس براستہ عقیدہ آتی تو اس میں روحانیت ہوتی اور اس کی بنیاد پر انسان اخلاقی اقدار کا پابند ہوتا، لیکن جب سائنس مادی بنیادوں پر ترقی پزیر ہوئی تو اس نے انسان کو احساسات سے محروم کر کے غیر انسانی شکل دے دی۔ اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

مبارک علی

پہلی بات تو یہ ہے کہ عقیدے اور سائنس کا باہمی کوئی تعلق نہیں ہے۔ کیونکہ سائنس تجربے اور پھر اس تجربے کو دوبارہ سے ثابت کر کے آگے بڑھتی ہے۔ عقیدے میں کسی تجربے کی گنجائش نہیں ہوتی ہے۔ اب رہا روحانیت کا سوال تو یہ عقیدے کا ایک حصہ ہے۔ جس پر ایمان لاتے ہوئے انفرادی طور پر لوگ نجات کی راہ تلاش کرتے ہیں۔ روحانیت کے ذریعے کبھی بھی معاشرے کو تبدیل نہیں کیا گیا۔ بقول رومیلا تھاپر اہل مغرب، مشرق کے لوگوں کو مشورہ دیتے رہے کہ اپنے روحانی درجے بلند کریں اور وہ خود مادی وسائل کو استعمال کر کے دنیا پر اپنا تسلط قائم کرتے رہے۔

جہاں تک اخلاقی اقدار کا تعلق ہے ان کا روحانیت سے کوئی واسطہ نہیں یہ معاشرے کی ضرورتوں اور مفادات کو پورا کرنے کے لیے ہوتی ہیں لیکن سوسائٹی میں بحران اس وقت آتا ہے جب سیاست، معیشت اور تاریخ سے اخلاقی اقدار کو نکال کر انہیں خالص مفادات کے لیے استعمال کیا جائے۔ سائنس سے بھی اگر اخلاقی اقدار کو نکال دیا جائے تو یہ دنیا کے لیے مہلک بن جاتی ہے۔ اس لیے اصل مسئلہ یہ ہے کہ انسانی معاشرے کی کن بنیادوں پر تشکیل کی جائے۔ طبقاتی معاشروں میں حکمران طبقے روحانیت اور مادیت دونوں کو پامال کر کے اپنے مفادات کو حاصل کریں گے۔ اس لیے غیر طبقاتی معاشرے میں یہ ممکن

ہے کہ انسان اخلاقی اقدار پر عمل کرتے ہوئے کسی کا استحصال نہ کرے۔

بلند اقبال

ڈاکٹر صاحب یہ کہاں تک صحیح ہے کہ جب عقیدے اور سائنس کا آپس میں ملاپ ہوتا ہے تو دونوں ترقی کرتے ہیں۔ لیکن جب عقیدہ زوال پذیر ہوتا ہے تو سائنس بھی اس کے ساتھ زوال پذیر ہو کر ختم ہو جاتی ہے؟

مبارک علی

نہیں یہ درست نہیں ہے اول تو عقیدہ اور سائنس دونوں کا ملاپ ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ عقیدہ اپنی جگہ مستحکم رہنا چاہتا ہے اور کسی تبدیلی کا خواہش مند نہیں ہوتا ہے۔ اس لیے جب ہم عقیدے اور سائنس کے درمیان روابط کو دیکھتے ہیں تو عقیدے کے ماننے والے کوشش کرتے ہیں کہ اس کی نئی تشریح کر کے اسے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق لا کھڑا کریں۔ مگر سائنس اور ٹیکنالوجی میں اس قدر تیزی سے ایجادات ہو رہی ہیں اور تبدیلیاں آ رہی ہیں کہ عقیدہ ان کا ساتھ نہیں دے سکتا اور ایک جگہ آ کر ٹھہر جاتا ہے۔ سائنس اس لیے آگے بڑھتی ہے کہ وہ کسی ایک سچائی کو نہیں مانتی ہے بلکہ موجودہ سچائی کو غلط ثابت کر کے ایک اور نئی سچائی کی تلاش میں ہوتی ہے۔ لہٰذا ان دونوں کا آپس میں کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ سائنسی انکشافات کے سامنے عقیدہ کمزور ہو رہا ہے۔ اور سائنس و ٹیکنالوجی برابر آگے کی جانب جا رہی ہے۔

بلند اقبال

ڈاکٹر صاحب اسلامی سائنس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

مبارک علی

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اس قسم کی اصلاحات ہی غلط ہیں۔ یعنی اسلامی سائنس، یہودی سائنس، عیسائی سائنس یا ہندو سائنس، سائنس کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے۔ یہ اپنی جگہ آزاد ہوتی ہے۔ اگر اسے مذہب کی زنجیروں میں جکڑ دیا جائے تو یہ کوئی ایجاد کرنے کے قابل نہیں ہوتی ہے۔ کیونکہ سائنسدان لیبارٹری میں تجربے کرتا ہے تو اس کی بنیاد مذہب پر نہیں بلکہ تجربے اور مشاہدے پر ہوتی ہے۔ لہٰذا سائنس مذہب کے معاملے میں مکمل غیر جانب دار ہوتی ہے۔

بلند اقبال

کیا عقیدے اور سائنس کی تشکیل ایک جیسی بنیادوں پر ہے یا ان دونوں میں فرق ہے؟

مبارک علی

عقیدے اور سائنس دونوں کی ساخت جدا جدا بنیادوں پر ہے۔ جیسا کہ میں نے بار بار کہا ہے کہ عقیدہ مکمل سچائی پر یقین رکھتا ہے۔ جب کہ سائنس میں سچائی بدلتی رہتی ہے۔ لہٰذا مذہب کو اگر عبادات تک رکھا جائے اور اسے دنیاوی معاملات یا پیشہ وارانہ امور سے دور رکھا جائے تو اس صورت میں مذہب سوسائٹی میں اپنا کردار ادا کرتا رہے گا۔ سائنسدان ہوں یا کسی ٹیکنالوجی کے ماہرین یا حساب کتاب کے ماہرین مذہب کو ان کے معاملات میں دخل دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ انہیں اپنے پیشہ وارانہ امور پوری ذمہ داری سے سرانجام دینا چاہیے۔

بلند اقبال

ڈاکٹر صاحب کیا آپ کوئی ایسا لفظ تجویز کر سکتے ہیں جو عقیدے اور علم کے باہمی

ربط کو ثابت کر سکے؟ کیا یہ ایک سکے کے دو رُخ ہیں؟

مبارک علی

جی نہیں یہ ایک سِکّے کے دو رُخ نہیں ہیں بلکہ دو علیحدہ علیحدہ سکے ہیں۔ جن کی اپنی جدا گانہ شناخت ہے۔ ان دونوں کو آپس میں نہیں ملایا جا سکتا۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے متصادم رہتے ہیں لیکن تاریخ کے مطالے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ علم کی وسعت اور توانائی کے سامنے عقیدہ شکست کھا جاتا ہے۔

بلند اقبال

ڈاکٹر صاحب آپ کا بہت شکریہ آج ہم نے مختصر وقت میں اس اہم موضوع پر گفتگو کی امید ہے ہمارے ناظرین اس سے ضرور مستفید ہوئے ہونگے۔

☆......☆......☆

6- کیا جنگ ایک جرم ہے؟

بلند اقبال

جنگ کے بارے میں جب ہم ذکر کرتے ہیں تو مجھے آئن سٹائن کا یہ قول نظر آتا ہے جو اس نے پہلی اور دوسری عظیم جنگوں کے بعد کہا تھا کہ اگر تیسری جنگ عظیم ہوئی تو اس کے بارے وہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ کن ہتھیاروں سے لڑی جائے گی لیکن چوتھی جنگ عظیم کے بارے میں وہ کہہ سکتا ہے کہ یہ پتھروں سے لڑی جائیگی، ناظرین جنگ ایک خوفناک عمل ہے جو تباہی اور بربادی لے کر آتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہم جنگ کو مقدس بنا کر اسے شاندار بنا دیتے ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان تین بڑی جنگیں لڑ چکے ہیں۔ جن سے کوئی مسائل حل نہیں ہوئے لیکن اس کے باوجود ہم جنگ کے لیے تیار ہیں۔ اگر ہم جنگ کو عالمی تناظر میں دیکھیں تو کبھی دنیا سرد جنگ میں مبتلا تھی اور اس وقت دہشت گردی کے خلاف جنگ کا سلسلہ جاری ہے۔ کیا وجہ ہے کہ اپنی تباہ کاریوں کے باوجود دنیا جنگوں سے چھٹکارہ حاصل نہیں کر سکی، آج اس موضوع پر بات کرنے لیے ہمارے ساتھ ڈاکٹر مبارک علی ہیں جن سے ہم جنگ کے بارے میں گفتگو کریں گے۔

مبارک علی

جنگوں کو مقبول بنانے میں مورخوں کا بڑا ہاتھ ہے کیونکہ جنگ کو وہ ایک ڈرامے کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔ جس میں فتح اور شکست کے مناظر ملتے ہیں۔ فاتح اپنی فتح پر جشن

مناتے ہیں جبکہ شکست کھانے والے اپنے غموں اور دکھوں میں ڈوب کر خاموش ہو جاتے ہیں۔ فاتح جشن مناتے ہوئے یہ نہیں سوچتے کہ ان کے بھی فوجی اس جنگ میں مارے گئے ہیں اور لاتعداد زخمی بھی ہوئے لیکن ان سب سے وہ بے نیاز مرنے والوں کی لاشوں پر خوشی مناتے رہے ہیں۔

یونان کے دو مورخوں نے جنگ کو اپنی تاریخ کا موضوع بنایا ہے۔ ہیروڈوٹس نے ایران اور یونان کی جنگوں کا حال لکھا ہے۔ اس کے نزدیک یہ جنگیں آزاد اور آزاد جمہوری نظام اور جابر اور استبدادی نظام کے درمیان تھیں۔ اس لیے وہ یونان کی فتح کو جمہوریت کی فتح کہتا ہے۔ تھیوسی ڈیڈیز نے ایتھنز اور اسپارٹا کے درمیان ہونے والی جنگوں کا حال لکھا ہے جو تیس سال تک جاری رہیں۔ بعد کے مورخوں نے بھی اپنی تاریخوں میں جنگ کے موضوع کو اہمیت دی اور جنگی سورماؤں کا تذکرہ بڑی آب و تاب سے کیا۔

اب ہم اس سوال کی طرف آتے ہیں کہ جنگیں کیوں لڑی جاتی ہیں؟ تاریخ کی ابتدائی دور میں خانہ بدوش قبائل غذا کے حصول کے لیے آبادیوں پر حملے کرتے تھے، اس سے بچاؤ کے لیے بستی والوں نے جنگ جو ملازم رکھے لیکن جب تاریخ میں ریاست کا قیام عمل میں آیا تو ریاستوں کے درمیان جنگوں کا آغاز اس لیے شروع ہوا کہ طاقتور ریاستیں اپنی وسعت کے لیے زمینوں پر قبضہ کرنا چاہتیں تھیں۔ اور دوسروں کی محنت کی کمائی کو لوٹنا بھی اس کا مقصد تھا لوٹ کا یہ مال مالِ غنیمت کہلایا، جس پر قبضہ کرنا فاتح نے اپنا حق سمجھا۔

اب ہم اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کریں گے کہ آخر لوگ جنگ میں جان دینے کے لیے کیوں تیار ہوتے ہیں، تاریخ میں ہمیں اس کی کئی وجوہات ملتی ہیں مثلاً مذہب کے ذریعے لوگوں کو تیار کیا جائے کہ وہ اس کے تحفظ کے لیے جان قربان کریں۔ جس کا صلہ انہیں دیوتاؤں کی جانب سے ملے گا۔ اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ دو قبیلے اپنے اپنے دیوتاؤں کی مدد سے میدان جنگ میں آتے ہیں۔ اور یوں یہ جنگ دو قبیلوں کے ساتھ ساتھ دو دیوتاؤں کے درمیان بھی ہو جاتی ہے۔ دوسرا جذبہ جو جنگ کے لیے جان نثار کرنے پر تیار

کرتا ہے وہ قوم اور وطن کا ہوتا ہے جس کی حفاظت کرنا مقدس فریضہ ہو جاتا ہے۔ یورپی سامراج نے ایشیاء اور افریقہ کے ملکوں پر قبضے کے لیے یہ نظریہ سازی کی کہ کیونکہ سفید فام اقوام بہت مذہب ہوگئیں ہیں لہٰذا ان کا یہ فرض ہے کہ وہ ایشیاء اور افریقہ کی غیر مہذب قوموں کو مہذب بنائیں لہٰذا انہوں نے تہذیب کے نام پر جنگیں لڑیں۔

موجودہ دور میں جب نظریاتی ریاستوں کا وجود عمل میں آیا تو نظریہ جنگ کا سبب بن گیا جیسے جرمنی کی نازی پارٹی نے آریائی نسل کی برتری کے نظریے کی بنیاد پر یورپ میں جنگیں لڑیں۔ کمیونسٹ اور سوشلسٹ ملکوں نے اپنے نظریے کی بنیاد پر دفاعی جنگیں بھی لڑیں اور سامراج سے آزادی کے لیے مقابلے بھی کئے۔

قومیں اپنے تجارتی مفادات کے لیے بھی جنگیں لڑتیں ہیں جیسے رومیوں اور کارتھیج کے درمیان تین بھیانک جنگیں ہوئیں جن کا مقصد یہ تھا کہ سپین اور سسلی کی بندرگاہوں پر قبضہ کیا جائے۔ جب یورپی تاجر تجارت کی غرض سے ہندوستان اور انڈونیشیاء میں آئے تو انہوں نے بھی جنگ کے ذریعے تجارتی مفادات پورے کئے، جاپان کو بھی فوجی حملے کی دھمکی دے کر اس کی بندرگاہ کو تجارت کے لیے کھلوایا۔

غلام، کسان اور محروم طبقوں کے لوگ بھی بغاوت اور جنگ کر کے اپنے حقوق حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ لہٰذا تاریخ میں جنگ کو مسائل کا حل سمجھا جاتا ہے۔

بلند اقبال

وہ کونسی روایات ہیں جو جنگ کو نہ صرف مقدس بناتی ہیں بلکہ اسے سماج میں شاندار مقام بھی دیتی ہیں؟

مبارک علی

جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے کہ کسی بھی فرد کے لیے اپنی زندگی قربان کرنا آسان نہیں ہوتا ہے۔ جب تک وہ کسی نظریے یا عقیدے پر یقین نہ رکھتا ہو، لیکن ہم یہ بھی دیکھتے

ہیں کہ کرائے کے فوجی بھی ہوتے ہیں جو پیسے کی خاطر لڑتے ہیں، جنگ ان کے لیے دولت کمانے اور لوٹنے کا ذریعہ ہوتی ہے۔

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کے تقریباً ہر معاشرے میں فوجیوں اور جنگ لڑنے والوں کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ جنگ کو مقبول بنانے میں مؤرخوں' شاعروں' ناول اور افسانہ لکھنے والوں کا حصہ ہوتا ہے۔ شاعر اپنی شاعری میں جنگی ہیروز کی تعریف و توصیف کرتے ہیں، ان کی جوانمردی، شجاعت اور بہادری کے قصیدے لکھتے ہیں، ان جنگی سورماؤں کی داستانیں جب گاؤں کی چوپال یا شہر کی مجلسوں میں بیان کی جاتی ہیں تو نوجوانوں میں ان کی تقلید کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور یہ روایات لوگوں میں پھیل جاتی ہیں کہ بہادر وہ ہے جو سینے پر زخم کھائے، میدان جنگ میں فرار ہونا باعثِ شرم ہو جاتا ہے۔ یونان کی ریاست اسپارٹا کہ جہاں نوجوانوں کو جنگ کی تربیت دی جاتی تھی وہاں یہ روایت تھی کہ یا تو جنگ میں لڑتے ہوئے لڑنے کے بعد لاش کو ڈھال پر رکھ کر لایا جائے یہ خاندان کے لیے باعثِ فخر تھا۔ جنگ سے بھاگ کر آنے والوں کے لیے معاشرے میں کوئی جگہ نہیں تھی۔ ہندوستان میں راجپوت جب جنگ میں شکست کے آثار دیکھتے تو وہ جوہر کی رسم ادا کرتے تھے۔ عورتوں اور بچوں کو قتل کر کے وہ لڑتے ہوئے مارے جاتے۔

معاشرے میں بھی جنگی سورماؤں کے لیے بڑی عزت ہوتی تھی۔ آرٹسٹ ان کی تصاویر بنا کر انہیں نئی زندگی دیتے تھے اور ریاست ان کے مجسموں کو شہر کے چراہوں اور اہم عمارتوں پر نصب کرتی تھی ہمیں کسی ادیب، شاعر، سکالرز اور موسیقار کے مجسمے نہیں ملتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سوسائٹی میں اہل علم کے مقابلے میں جنگی سورماؤں کی اہمیت کتنی زیادہ ہے۔

بلند اقبال

ناظرین جب ہم جنگ کے موضوع پر گفتگو کرتے ہیں تو ہمیں یہ سوال تنگ کرتا ہے کہ وہ کون سے مذہبی سیاسی اور نظریاتی عوامل ہوتے ہیں جن کی بنیاد پر لوگوں کو میدان

جنگ میں دھکیلا جاتا ہے اور حکمران طبقے ان کی لاشوں پر اپنے مفادات حاصل کرتے ہیں۔

مبارک علی

آپ نے جو کچھ کہا یہ تصویر کا ایک رخ ہے لیکن ایک دوسرا رُخ بھی ہے جو لوگوں کے صحیح خیالات اور جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔ مثلاً حال ہی میں پہلی جنگِ عظیم کے درمیان فوجیوں کے لکھے گئے خطوط سامنے آئے ہیں جو انہوں نے اپنے خاندان والوں کو لکھے تھے ان خطوط میں انہوں نے محض جنگ کے بارے میں لکھا ہے کہ خندقوں میں رہتے ہوئے ان کی کیا حالت تھی۔ بارش اور سردی نے ان کو جسمانی طور پر مفلوج بنا دیا تھا۔ ہر ایک پر موت کا خوف طاری تھا۔ خندق میں مارے جانے والے ساتھیوں کے درمیان وہ بھی موت کا منتظر تھے۔ ان خطوط میں کہیں بھی قوم وطن اور مذہب کے لیے جان دینے کی کوئی بات نہیں کی گئی۔ بلکہ انہیں اپنا گھر ماں باپ اور بیوی بچے یاد آتے رہے کہ ان کے ساتھ رہ کر وہ ایک پرامن اور خوشگوار زندگی چاہتے تھے۔ ان خطوط نے وہ سارے مفروضے ختم کر دیئے کہ جن میں جنگ کو شاندار قومی فریضہ بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد ایک فرانسیسی فلم ساز نے اس موضوع پر ایک فلم بنائی اس میں دکھایا گیا ہے کہ ایک رات جنگ میں مارے جانے والے فوجی اپنی قبروں سے نکل کر آتے ہیں اور جب وہ اپنے دیہاتوں اور شہروں میں جاتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ چہل پہل ویسی ہی ہے جیسے کہ ان کی زندگی میں تھی لوگ رقص کر رہے ہیں گانے گا رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر ان کا کہنا تھا کہ اگر زندگی کو اس طرح جاری رہنا تھا تو پھر ان کو کیوں اس سے محروم رکھا گیا اور ان کی جانیں لی گئیں۔

جنگ ہی کے موضوع پر ایک اور ناول نگار نے مرنے والے فوجیوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ سرکٹی لاشو! اُٹھو اور اپنے قاتلوں سے حساب مانگو کہ جنھوں نے اپنے مفادات کے لیے تمہیں قربان کر دیا۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ جب جنگ کی خون ریزی اور تباہی لوگوں کے سامنے آئی تو ایسے دانشور، آرٹسٹ اور اہل علم سامنے آئے کہ جنہوں نے جنگ کے تقدس کو

پارہ پارہ کر دیا۔ انہوں نے حکمرانوں، سیاستدانوں اور سرمایہ داروں کے مفادات کو بیان کیا جو جنگ کا سبب بنتے رہے ہیں یہ بڑی انقلابی تبدیلی ہے کہ جس میں جنگ کے بجائے امن پر زور دیا گیا ہے۔

بلند اقبال

ڈاکٹر صاحب آپ نے صحیح کہا کہ جنگ کے بارے میں جو خیالات کی تبدیلی آئی ہے۔ اس سلسلے میں اب جنگی جرائم کی بات کی جانے لگی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جن ملکوں نے عام لوگوں کا قتل عام کیا عورتوں کو ریپ کیا دیہاتوں اور شہروں کو لوٹ مار کر خاکستر کیا۔ یہ جنگی جرائم کے مرتکب ہوئے لیکن سوال یہ ہے کہ ان کو سزا کون دے گا؟

مبارک علی

آپ کی یہ بات صحیح ہے کہ جنگی جرائم کے بارے میں سوال اٹھانا اور نہ صرف ان کی مذمت کرنا بلکہ ان کو سزا دینے کا مطالبہ بھی کرنا۔ لیکن سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ جب طاقتور اور بڑے ملک جنگی جرائم میں ملوث ہوتے ہیں تو ان کو سزا دینے والا کوئی ادارہ نہیں ہے۔ مثلاً امریکہ نے ویت نام میں جنگی جرائم کا ارتکاب کیا، رسل نے ایک آرگنائزیشن کے ذریعے ان جرائم کی تفصیلات کو بیان بھی کیا۔ لیکن امریکہ چونکہ ایک طاقتور ملک ہے اس لیے اسے اس کی کوئی سزا نہیں ملی۔ اس نے ناگاساکی اور ہیروشیما پر بم گرا کر انہیں تباہ کر دیا۔ حال ہی میں عراق پر حملہ اس کی ایک اور مثال ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ جنگی جرائم کا ادارہ جہاں تک اس کی پہنچ ہے وہ ان جرائم کو سامنے لا رہا ہے۔ جیسے کروشیا اور بوسنیا میں جنگی جرائم پر سزائیں دی گئی ہیں۔

اب اسی بنیاد پر کوریا کے عوام مطالبہ کر رہے ہیں کہ جاپان نے اس پر قبضہ کرنے کے بعد جو مظالم کئے تھے اس کی سزا اسے ملنی چاہیے خاص طور پر وہ عورتیں جو کمفرٹ عورتیں کہلاتی ہیں اور جن سے جاپانی فوجیوں نے جنسی تعلقات رکھے تھے وہ نہ صرف سزا کا مطالبہ

کرتیں ہیں بلکہ معاوضے کا بھی دوسری جنگ عظیم کے دوران ہی جاپان نے چین پر حملہ کر کے ''نان کنگ'' میں لوگوں کا قتل عام کیا تھا۔ ان کے یہ جرائم اب لوگوں کے سامنے تصاویر کے ذریعے آ گئے ہیں۔ لہٰذا جنگی جرائم کے بارے میں لوگوں میں شعور تو آ گیا ہے۔ لیکن ابھی بھی جرم کرنے والے ملک اور قومیں اعتراف نہیں کرتے ہیں۔

اگر ہم تاریخ کا مطالعہ کریں تو یہ جنگی جرائم ماضی میں بھی ہوتے رہے ہیں۔ فرانس، برطانیہ، ہالینڈ اور بیلجیم نے اپنی کالونیز میں لوگوں کا قتل عام کیا۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ یہ قاتل اپنی قوم میں ہیرو بن جاتے ہیں۔ جیسے ڈائر نے جلیانوالہ باغ میں لوگوں کا قتل عام کیا تو برطانیہ کی قوم نے اسے ہیرو بنا کر اسے تحفے تحائف دیئے۔ امریکہ کے فوجی کرنل نے ویت نام کے ایک گاؤں ''کمالی لائی'' میں لوگوں کا قتل عام کیا تو امریکہ میں وہ ہیرو بن کر ابھرا اور موسیقاروں نے اس کے لیے گیت گائے۔

ہٹلر اور اس کی نازی پارٹی نے جو جنگی جرائم کئے کہ گیس چیمبر میں یہودیوں، خانہ بدوشوں اور کیمونسٹوں کو قتل کیا گیا تو شکست کے بعد اتحادیوں نے نازی لیڈروں پر جنگی جرائم کے مقدمے چلائے اور سزائیں دیں۔ یعنی اگر کسی قوم کو شکست دے دی جائے تو اس پر جنگی جرائم کا مقدمہ چلایا جا سکتا ہے۔ مگر جو فاتح اور طاقتور ہے وہ آج بھی جنگی جرائم سے مبرا ہے۔

بلند اقبال

ڈاکٹر صاحب کیا وجہ ہے کہ جنگ کے دوران اس قدر نفرت اور دشمنی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے کہ عورتوں کو ریپ کیا جاتا ہے بچوں اور بوڑھوں کو قتل کیا جاتا ہے ایسے محسوس ہوتا ہے کہ انسان جنگ کے دوران جنون کی کیفیت میں ہوتا ہے۔ اور اس میں انسانیت کے تمام جذبات اور احساسات ختم ہو جاتے ہیں؟

مبارک علی

آپ نے جو سوال کیا ہے کہ جنگ میں انسانی جذبات کیوں ختم ہو جاتے ہیں اور

کیوں فاتحین مفتوحین کے ساتھ ظالمانہ سلوک کرتے ہیں۔ ذہنیت کے تبدیل ہونے کے کئی وجوہات ہوتیں ہیں اگر جنگ مذہبی اور نظریاتی جذبے سے لڑی جائے تو مخالفین نہ صرف دشمن رہیں بلکہ گمراہ بھی رہیں، ان کو قتل کر کے نیست و نابود کر دینا باعثِ رحمت ہے۔ دوسرا جذبہ مالِ غنیمت کا حاصل ہوتا ہے۔ شکست کھانے والی قوم کے مردوں کو غلام اور عورتوں کو کنیزیں بنالیا جاتا ہے۔ تیسرا یہ خوف اور ڈر بھی ہوتا ہے کہ اگر دشمن کو ختم نہ کیا گیا تو پھر یہ متحد ہو کر ہمارے خلاف آ جائے گا۔ اس لیے ان کی نسل ہی کو ختم کر دیا جائے۔ اور یہ ایک عجب ستم ظریفی ہے کہ وہ فاتحین جنہوں نے لوگوں کو قتل عام کیا اس بنیاد پر انہیں عظیم کہا جاتا ہے جیسے سکندر اعظم، اگر دیکھا جائے تو یہ لوگوں کا قاتل تھا اور یہ اس کی عظمت کی وجہ نہیں ہونی چاہیے تھی، ہم تاریخ میں فاتحین کی تعریف و توصیف کرتے ہیں جبکہ درحقیقت یہ انسانیت کے مجرم ہیں۔ حال ہی میں ایک ہندوستانی مورخ سنجے سانیال نے اشوک کے بارے میں لکھا ہے کہ اشوک دی گریٹ واز نوٹ (not) سو گریٹ یعنی اشوک عظیم، عظیم نہیں تھا جس نے اپنے 99 بھائیوں کو قتل کیا اور مذہب کے فرقے کے لوگوں کو قتل عام کیا۔ تاریخ میں جنگ کی تباہیوں کی پوری تفصیل ملتی ہے۔ جرمنی کی تین سالہ مذہبی جنگ میں تیس فیصد جرمنی تباہ ہو گیا تھا۔ اس کے گاؤں، دیہات اور شہر ویران ہو گئے تھے۔ جنگ کی تباہی نے جرمنی کو دوسرے یورپی ملکوں کے مقابلے میں ڈیڑھ سو سال پیچھے کر دیا تھا اور پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جنگ میں لوگ مرتے ہی نہیں بلکہ زخمی اور اپاہج بھی ہو جاتے ہیں۔ خاندان کے خاندان تباہ ہو جاتے ہیں۔ حکمرانوں کے مفاد کی قیمت عوام کو دینی پڑتی ہے۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد نازی پارٹی جرمنی میں برسر اقتدار آئی تو اس نے نظریات کی وجہ سے اور آمرانہ طرز حکومت کی وجہ سے جرمنی سے شاعروں، ادیبوں، سائنسدانوں، فلسفیوں اور موسیقاروں کو جلاوطن کر دیا اور جرمنی کی یونیورسٹیز بنجر اور ویران ہو گئیں۔ ہٹلر نے چیکوسلوا کیا اور پولینڈ میں جہاں جرمن آباد تھے۔ ان کے نام پر ان ملکوں پر قبضہ کر لیا۔ لیکن جب جرمن کو شکست ہوئی تو اس کی قیمت ان جرمنوں کو ادا کرنی پڑی جو مشرقی یورپ

اور روس میں آباد تھے۔

جنگوں کی ہولناکیاں دنیا کے سامنے ہیں لیکن اس کے باوجود آج بھی تباہ کن اسلحہ تیار ہو رہا ہے۔ اور آج بھی اسلحے کے بیوپاری قوموں کو جنگ میں الجھا رہے ہیں۔

یقیناً جنگ کے خلاف لوگوں کے جذبات ہیں۔ جب امریکہ نے عراق پر حملہ کیا تو لاکھوں لوگوں نے مظاہرے کئے لیکن اس کے باوجود عراق پر حملہ ہوا اور آج تک عراق اس جنگ سے باہر نہیں نکل سکا۔ تو اس لیے سوال پیدا ہوا ہے کہ کیا جب بھی کوئی قوم طاقتور ہو جاتی ہے تو وہ جنگ کے ذریعے اپنی طاقت کا مظاہرہ کرتی ہے۔ جب تک طاقت اور برتری کا تصور نہیں بدلے گا، اس وقت تک جنگ کے ذریعے طاقت ور قومیں اپنے اقتدار کو قائم کرتیں رہیں گی۔

بلند اقبال

اب ہم ہندوستان اور پاکستان کی جانب آتے ہیں۔ برصغیر کی تقسیم 1947 میں دوسری جنگ عظیم کے بعد ہوئی اس جنگ میں ہندوستانی فوجی بھی شریک تھے اور ٹیکنالوجی کی وجہ سے اس جنگ نے جو بھیانک شکل اختیار کی وہ سب لوگوں کے سامنے ہے۔ ہندوستان اور پاکستان دو آزاد ملک بن گئے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ابتداء ہی سے دونوں ملکوں کے درمیان نفرت اور دشمنی کے جذبات تھے اور دونوں ملکوں نے اپنے مسائل کو اچھے طریقے سے حل کرنے کے بجائے جنگ کو ترجیح دی تو ناظرین ہم کوشش کریں گے کہ ہندوستان پاکستان کی اس صورت حال کو سمجھ سکیں۔

مبارک علی

ہندوستان اور پاکستان دونوں ملک اگرچہ برصغیر کا حصہ ہیں لیکن تقسیم نے ان کے درمیان فرق کی ایک دیوار کھڑی کر دی اور دونوں ملکوں میں اس بات پر مقابلہ ہے کہ فوجی طور پر کون طاقتور ہے۔ کیونکہ نظریہ یہ ہے کہ جو ملک فوجی لحاظ سے طاقتور ہوگا اور جس کے

پاس جدید اسلحہ اورٹیکنالوجی ہوگی۔ وہ کامیاب اور فاتح ہوگا۔فوجی طاقت حاصل کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ قومیں اپنے تمام وسائل اس پرخرچ کر دیتی ہیں اوراس کی قیمت عام لوگوں کوادا کرنی پڑتی ہے۔جنہیں نہ تعلیم ملتی ہے نہ روزگار، نہ رہائش، نہ مناسب غذا نہ صاف پانی اور نہ صحت کی کوئی سہولت۔ بالآخر اقوام اس بوجھ سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ مقابلہ ہم روس اور امریکہ کے درمیان دیکھ چکے ہیں۔جس نے روس کو بالآخر اپنی تمام قوتوں کے باوجود توڑ کر رکھ دیا خود امریکہ میں بھی عام لوگ غربت کا شکار ہیں جبکہ امریکہ میں اسلحہ کے تاجر مشرق وسطی میں اپنا اسلحہ فروخت کر کے جنگ کی ہمت افزائی کرتے ہیں۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ پاکستان اور ہندوستان دونوں اپنی فوجی قوت بڑھانے میں مصروف ہیں۔ جب ہندوستان نے ایٹم بم بنایا تو مقابلے کے لیے پاکستان نے بھی ایٹمی صلاحیت حاصل کر لی۔جبکہ سب جانتے ہیں کہ اگر ایٹم بم کا استعمال ہوا تو اس کا نتیجہ مکمل تباہی ہوا لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ مقابلہ فوجی طاقت حاصل کرنے میں ہے یہ نہیں کہ معاشی، سماجی اور علمی میدان میں مقابلہ کر کےعوام کی حالت کو بہتر بنائیں۔

بلند اقبال

پاکستان اور ہندوستان کے درمیان کونسے مسائل ہیں جو جنگ کا باعث ہیں؟

مبارک علی

پاکستان اور ہندوستان کے مسائل پر بات کرتے ہوئے ہمیں انگریزی حکومت اوران کی پالیسی کوبھی دیکھنا چاہیے یورپی سامراجی ملک جب ایشیاءاورافریقہ سے گئے ہیں تو وہ اپنے پیچھے ملکوں کے درمیان سرحدی تنازعات کو چھوڑ کر گئے ہیں جس کی وجہ سے یہ ملک باہمی جنگ و جدل میں مصروف ہیں۔ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان یہ سرحدی تنازعات موجود ہیں۔جسکی سب سے بڑی مثال کشمیر کا تنازعہ ہے۔تقسیم کے بعد انہی دونوں ملکوں کے درمیان پہلی جنگ کشمیر کے مسئلے پر ہی ہوئی۔ جب فائر بندی ہوئی تو ایک حصہ

پاکستان کے پاس رہا اور دوسرا ہندوستان کے پاس۔

کشمیر ہی کے مسئلے پر دوسری جنگ 1965ء میں ہوئی، لیکن یہ جنگ زیادہ عرصہ نہیں چل سکی کیونکہ سترہ دن کے بعد ہمارا اسلحہ ختم ہو گیا اور تاشقند کے معاہدے کے تحت جنگ کو ختم کر کے ہندوستان کے ساتھ نئے تعلقات کی بنیاد رکھی۔

بلند اقبال

اس جنگ میں کون فتح یاب ہوا اور اس کے کیا نتائج نکلے؟

مبارک علی

جہاں تک فتح یاب ہونے کا تعلق ہے تو دونوں جانب سے دعوی تو یہی کیا جاتا ہے کہ وہ فتح یاب ہوئے لیکن معاہدے کے نتیجے میں ہندوستان نے جن علاقوں پر قبضہ کیا تھا اسے وہ واپس کرنا پڑے۔ لیکن کشمیر کا مسئلہ اسی طرح سے رہا اس کا کوئی حل نہیں نکل سکا۔ اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ مسئلہ اور پیچیدہ ہو رہا ہے۔

بلند اقبال

تیسری اہم جنگ 1971ء کی ہے کہ جس میں پاکستان کو شکست کا سامنا کرنا پڑا اس کے نوے ہزار فوجی جنگ کے قیدی بنے۔ بنگلہ دیش آزاد ہوا اور دنیا بھر میں ہماری رسوائی بھی ہوئی۔

مبارک علی

یہ بات صحیح ہے کہ 1971ء کی جنگ میں پاکستان کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا لیکن ضرورت اس بات کی تھی کہ اپنی شکست اور ناکامی سے کچھ سبق سیکھ کر کوشش کرتے کہ آئندہ ہم ایسے حادثات سے دو چار نہیں ہوں گے۔ ہندوستان اور پاکستان کے عوام نے ڈائیلاگ

کے ذریعے اس بات کی کوشش کی کہ دونوں ملکوں میں خوشگوار تعلقات ہوں۔ دانشوروں اور طالب علموں کے باہمی تبادلے ہوئے۔ عام لوگوں کو ایک دوسرے سے ملنے کے مواقع ملے اور جب ہندوستان کے وزیراعظم واج پائی بذریعہ بس پاکستان آئے تو یہاں ان کا خیر مقدم کیا گیا۔ دونوں جانب سے عوام امید کررہے تھے کہ دوستی میں اضافہ ہوگا پھر اچانک کارگل کا واقعہ پیش آیا اور دوستی کی تمام توقعات ختم ہوگئیں۔ اب صورتحال یہ ہے کہ دونوں ملک کبھی قریب آنے کی کوشش کرتے ہیں تو کبھی جنگی فضا کو پیدا کرتے ہیں۔

بلند اقبال

یہاں پر میں یہ سوال کرنا چاہوں گا کہ 1945ء میں دوسری جنگ عظیم ختم ہوئی ہے۔ 1947ء میں پاکستان بنتا ہے اور اس کے فوراً بعد سرد جنگ کا آغاز ہو جاتا تقریباً 1989ء یعنی روس کے ٹوٹنے تک جاری رہتا ہے اس سرد جنگ کے دوران پاکستان کا کیا کردار رہا اور ابھی یہ جنگ ختم نہیں ہوئی تھی کہ ہم وار آن ٹیرر میں الجھ کر رہ گئے تو اس کے پاکستان پر کیا اثرات ہیں؟

مبارک علی

جنگ کا لفظ ہمارے ذہنوں پر اس قدر سوار ہے کہ ہم روزمرہ کی زبان میں اس کو بار بار استعمال کرتے ہیں اور خاص طور سے سیاستدان جنگ کے لفظ کو اپنی تقریروں میں بھی استعمال کر کے جوش وخروش پیدا کرتے ہیں مثلاً غربت کے خلاف جنگ، جہالت کے خلاف جنگ، توہمات کے خلاف جنگ تو جنگ کو مسائل کا حل سمجھا جاتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد جب سرد جنگ کی اصلاح کو استعمال کیا گیا تو اس کا مقصد یہ تھا کہ اب یہ جنگ پروپیگنڈے کے ذریعے لڑی جائے گی۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ اس سرد جنگ کے دوران کتابیں، پمفلٹس، اخباروں اور رسالوں میں زبردست پروپیگنڈا ہوتا ہے۔ دانشور حضرات اپنی تقاریر کے ذریعے اس جنگ میں حصہ لیتے ہیں۔ سیاستدان بھی اس موقع سے فائدہ اٹھا

کر اپنی سیاست چمکاتے ہیں۔ چرچل نے اپنی تقریر میں روس کے بارے میں آہنی پردہ (Iron Curtain) کے لفظ کو استعمال کیا تھا۔ سرمایہ دار ملکوں نے خاص طور پر امریکہ نے اس سرد جنگ میں مذہب کو پوری طرح استعمال کیا خاص طور سے مسلمان ملکوں نے روس کے اشتراکی نظام کو ملحدانہ کہہ کر اس کے خلاف پروپیگنڈا کیا۔ پاکستان میں بھی مذہبی جماعتوں نے سرد جنگ میں سرمایہ دار ملکوں کا ساتھ دیا۔ لیکن ایک لحاظ سے امریکہ کے لیے یہ سرد جنگ نہیں تھی کیونکہ اس نے ویت نام میں دخل اندازی کر کے تمام مہلک ہتھیاروں کا استعمال کیا۔ لیکن شکست کھائی، سرد جنگ کا خاتمہ روس کے زوال کے بعد ہوگیا۔

لیکن یہ سرد جنگ پھر بھی عملی طور پر مہلک شکل میں جاری رہی۔ افغانستان میں انقلاب کے بعد جب روسی فوجیں وہاں آئیں تو امریکہ ایک بار پھر جنگ کے لیے تیار ہوگیا لیکن اس بار اس نے یہ جنگ پاکستان کے حوالے کر کے اس سے کرائی۔ اس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے کہ افغانستان میں دخل اندازی کی وجہ سے ہم ایک ایسی جنگ میں الجھ گئے جس کا ہم سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ روسی فوج تو واپس چلی گئی لیکن ان کی جگہ طالبان نے لے لی اور جب امریکہ میں ''نائن الیون'' کا واقعہ ہوا تو افغانستان میں ایک نئی جنگ کا آغاز ہوا جو وار ان ٹیرر کے نام سے جانی جاتی ہے۔ پاکستان نے بھی اس میں شرکت کر کے دہشت گردی کی اس جنگ میں حصہ لیا۔ جس کی وجہ سے دہشت گردی کی واقعات نے پاکستان میں تباہ کن اثرات چھوڑے۔ یورپی ملکوں نے دوسری جنگ عظیم کے بعد جنگ سے توبہ کر لی ہے۔ جاپان نے بھی اپنے دستور میں جنگ نہ کرنے کا اعلان کیا ہے۔ اب جنگ کرنے کی ساری ذمہ داری امریکہ نے اپنے سر لے لی ہے۔ اور وہ اپنی ضرورت کے تحت اپنے حلیفوں کو بھی استعمال کرتا ہے جس میں پاکستان شامل ہے۔

بلند اقبال

جب جنگ قومیت کے نام پر لڑی جاتی ہے تو اس کے نتیجے میں لوگوں میں جوش و خروش پیدا ہو جاتا ہے۔ ہم پاکستان اور ہندوستان میں مذہب اور قومیت دونوں چیزوں کو

جنگ میں استعمال ہوتا دیکھتے ہیں۔ میرا سوال یہ ہے کہ کیا دونوں ملک جنگ کے تباہ کاریوں سے ناواقف ہیں اور لوگوں کو جنگی جنون میں مبتلا رکھے ہوئے ہیں۔ اس سے ہم کس طرح چھٹکارا پاسکتے ہیں؟

مبارک علی

یہ آپ کی بات درست ہے کہ جب مذہب اور قومیت کے نام پر جنگ لڑی جائے تو یہ لوگوں میں جنگی جنون کا باعث بنتے ہیں۔ بدقسمتی سے ہم اب تک جنگ کے بارے میں یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کسی میدان میں لڑی جائے گی اور وہاں فیصلہ ہوجائے گا لیکن اب جنگ میدان میں سے کر شہروں اور لوگوں کے گھروں تک آ گئی ہے۔ اب یہ زمینی جنگ نہیں رہی بلکہ فضائی اور بحری بھی ہوگئی ہے اب اس میں فوجی ہی نہیں مرتے ہیں بلکہ عام لوگ بھی ہلاک ہوتے ہیں۔ شہر تباہ ہوتے ہیں، کھانے پینے کی اشیاء کی قلت ہوتی ہے۔ ہسپتال زخمیوں سے بھر جاتے ہیں اور روز مرہ کی زندگی معطل ہو جاتی ہے جنگ لوگوں کو موت کے خوف میں مبتلا کر کے ذہنی انتشار کا باعث بنتی ہے۔ اس لیے جب بھی جنگ کی بات کی جائے تو اس کی تباہ کاریوں کو ذہن میں رکھنا چاہیے۔

میکاولی نے کہا ہے کہ حکمرانوں کو چاہیے کہ جب بھی وہ مشکلات کا شکار ہوں اور بحرانوں میں مبتلا ہوں تو جنگ کا اعلان کر دینا چاہیے۔ کیونکہ لوگ اپنے مصائب بھول کر جنگ میں شریک ہو جائیں گے۔ یہی کچھ پاکستان اور ہندوستان میں ہو رہا ہے۔ دونوں جانب سے حکمران، سیاستدان اور اب میڈیا بھی جنگی نعروں کے ذریعے لوگوں میں اشتعال پیدا کرتے رہتے ہیں۔ دونوں جانب سے جنگ کی دھمکیاں دے کر ایسا ماحول پیدا کرتے ہیں کہ لوگوں میں دشمنی کے جذبات اُبھریں اور جنگ کی خاطر اپنے مسائل بھول جائیں۔

تاریخ میں ہم دیکھتے ہیں کہ جنگ کبھی بھی مسائل کا حل ثابت نہیں ہوئی فیصلے ہمیشہ بات چیت کے ذریعے ہوئے۔ اس لیے تاریخ سے سبق سیکھنا چاہیے۔ جنگ کی ہولنا کیوں سے بچ کر امن کے ساتھ زندگی گزارنی چاہیے۔

بلند اقبال

ڈاکٹر صاحب ہم امن کی بات کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ انڈیا سے خوشگوار تعلقات رکھنا چاہتے ہیں۔تو فیس بک پر e-mail کے ذریعے اور خطوط کے ذریعے مجھ سے یہ سوال پوچھے جاتے ہیں کہ ہم انڈیا سے کیسے دوستی کی بات کریں جب گجرات میں مسلمانوں کا قتل عام کرایا گیا اور اب ہندوستانی فوجی جو کشمیریوں پر ظُلم ڈھا رہی ہے۔اس کو دیکھتے ہوئے امن کی بات کرنا مذاق معلوم ہوتا ہے۔

مبارک علی

دانشوروں کا اصل کام یہی ہے کہ اس وقت امن کی بات کریں جب لوگ جنگی جنون میں مبتلا ہوں۔کشمیر میں ہندوستانی فوج کا ہونا لوگوں پر وحشت کی علامت ہوتا ہے کیونکہ فوج کا ادارہ امن کے لیےنہیں ہوتا ہے۔کشمیری عوام اپنے حقوق کی جنگ لڑ رہے ہیں مگر مسلح فوج سے مقابلہ کرنا آسان نہیں ہے اس لئے عالمی سطح پر ایسی مہم چلانے کی ضرورت ہے کہ جو فوج کے مظالم سے لوگوں کو آگاہ کرے اور بین القوامی طور پر ہندوستان کو مجبور کرے کہ وہ کشمیر سے فوج کو واپس بلائے۔

بلند اقبال

پاکستان کے حوالے سے یہ کہنا چاہوں گا کہ یہاں بلوچستان اور سندھ میں وفاق کے خلاف تحریکیں چل رہی ہیں۔میرا سوال یہ ہے کہ اگر کشمیر پاکستان کے پاس ہوتا تو کیا ایسے امکانات تھے کہ آج کشمیری پاکستان کے خلاف لڑ رہے ہوتے ؟

مبارک علی

جی یہ بات درست ہے کہ سندھ اور بلوچستان کی تحریکیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ

پاکستان کی ریاست میں ان کو حقوق نہیں دیئے گئے لہٰذا اگر کشمیر میں بھی یہی صورتحال ہوتی تو وہ بھی حق بجانب ہوتے کہ اپنے حقوق کے لیے لڑتے۔

بلند اقبال

ڈاکٹر صاحب آپ کا بہت شکریہ، آج کی گفتگو سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ انسان کی زندگی کی بڑی اہمیت ہے۔ اور ریاست کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ انسانی زندگی کی حفاظت کرے اور اسے جنگ کے شعلوں میں نہ جھوکے، اس کے لیے انسانی جذبات کی ضرورت ہے، محبت کی ہمدردی کی نا کہ نفرت اور دشمنی کی۔

مبارک علی

یہ درست ہے کہ انسان کو زندگی ایک ہی بار ملتی ہے اور کسی کو یہ حق نہیں ہونا چاہیے کہ کسی دوسرے کو اس کی زندگی سے محروم کر دے۔ انسان جو اس دنیا میں آیا ہے اسے پورا حق حاصل ہے کہ وہ اسے بھرپور انجوائے کرے اور فطری موت پائے۔

آپ کا بھی بہت شکریہ آئندہ بھی آپ سے کسی ایسے ہی اہم مسئلہ پر بات چیت کے لیے اکٹھے ہوں گے۔

☆......☆......☆

6- ٹیکنالوجی

بلند اقبال

آج ہم جس موضوع پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔اس کا تعلق بڑھتی ہوئی ٹیکنالوجی سے ہے جس نے ہماری زندگیوں میں دخل اندازی کرتے ہوئے اسے اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔اب ہمارے اردگرد ٹیکنالوجی کے ایسے گیجٹس ہیں کہ جس کی تعبیر میں ہماری زندگی بے معنی نظر آتی ہے۔جس تیزی سے ٹیکنالوجی کا تسلط ہو رہا ہے اور دنیا بدل رہی ہے۔اس کا آخر کیا نتیجہ نکلے گا؟

مبارک علی

اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے میں ٹیکنالوجی کے بارے میں دو باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ٹیکنالوجی کا اولین دور وہ ہے جب یہ اپنی ابتدائی شکل میں انسانی معاشرے کی مدد کر رہی تھی اور انسان کا اس ٹیکنالوجی پر پورا پورا تسلط تھا کہ کس طرح وہ اسے اپنے مفادات میں استعمال کرے۔اس میں اس وقت تبدیلی آئی جب یورپ میں صنعتی انقلاب آیا اور ٹیکنالوجی نے ترقی کرتے ہوئے یہ صورت اختیار کر لی کہ انسان اس کا تابع ہو کر رہ گیا۔ٹیکنالوجی کے ان دو ادوار کے بعد اب میں چاہوں گا کہ پہلے دور کا مختصر جائزہ لیا جائے۔

انسانی ٹیکنالوجی کا پہلا دور جو ہم تک پہنچا ہے وہ غذا اور شکار کا ہے۔غذا کے

حصول کے لیے یہ ضروری تھا کہ اس کے پاس ایسے ہتھیار ہوں کہ جس سے وہ شکار کر سکے اس سلسلے میں اس نے پتھر کے اوزار بنائے یہ انسانی تخلیق کا پہلا کارنامہ تھا۔ اس کے بعد جیسے جیسے وسائل بڑھے اس نے تیر کمان اور نیزہ تیار کیا تا کہ شکار کرنے میں سہولت ہو، لیکن انقلابی تبدیلی اس وقت آئی جب انسانی معاشرہ زرعی ہوا اور اس نے کھیتی باڑی شروع کی، اس کے لیے نئ ٹیکنالوجی کی ضرورت تھی۔ لہٰذا ایسی ایجادات ہوئیں جنہوں نے زرعی پیداوار میں اضافہ کیا جیسے پھل، کھرپی، درانتی اور کلہاڑی وغیرہ ان ایجادات نے پیداوار میں اضافہ کیا جس کے نتیجے میں آبادی بھی بڑھی، لہٰذا ضرورت کے تحت کپڑا بننے کی صنعت اور مکانات تعمیر کرنے کے اوزار استعمال میں لائے جانے لگے۔ ان ایجادات نے ایک طرف تو انسان کو محنت اور مشقت سے بچایا اور دوسری جانب واضح غذا مہیا کی۔

لیکن جہاں ایسی ایجادات ہوئیں جنہوں نے انسانوں کو سہولتیں بہم پہنچائی وہیں مہلک ہتھیار دریافت ہوئے اور جن قوموں کے پاس یہ ہتھیار آ گئے انہوں نے ان کی مدد سے کمزور معاشروں اور قوموں پر حملہ کر کے ان کی زمینوں پر بھی قبضہ کیا اور شکست خوردہ قوم کے لوگوں کو غلام بنا کر ان سے محنت مشقت کرائی۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ تاریخ میں ٹیکنالوجی کے مثبت اور منفی دونوں پہلو ہیں اور یہ آج بھی جاری ہے۔

میں یہاں ٹیکنالوجی اور جنگ کے درمیان جو رشتہ ہے اس کا ذکر کرنا چاہوں گا کہ تاریخ میں ان لوگوں نے جو جنگی ٹیکنالوجی میں ترقی یافتہ تھے انہوں نے کس طرح سے ان ممالک پر فتح پائی جو اس ٹیکنالوجی سے محروم تھے۔ مثلاً 1526ء میں پانی پت کی پہلی جنگ میں بابر کو ابراہیم لودھی پر اسلئے فتح ہوئی کیونکہ اس کے پاس توپ خانہ تھا اور اسکی دوسری مثال ہسپانیہ کے دو حملے ہیں جو انہوں نے جنوبی امریکہ پر کئے کیونکہ جنوبی امریکہ کے لوگ یورپ کے مقابلے میں فوجی ٹیکنالوجی سے ناواقف تھے اور ان کے ہاں ابھی تک لوہا بھی دریافت نہیں ہوا تھا۔ ان کے مقابلے میں ہسپانوی توپوں اور رائفلوں سے مسلح تھے۔ لہٰذا انہوں نے آسانی سے جنوبی امریکہ کی تین بڑی تہذیبوں کو جس میں اسٹیک (Aztec) اِنکا

(Inca)اور مایا شامل تھیں انہیں تباہ کر دیا۔ یہی صورتحال افریقہ میں ہوئی جہاں جدید اسلحہ سے مسلح ہوکر یورپی اقوام نے افریقیوں کا قتل عام کیا۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس فوجی ٹیکنالوجی نے بہادری اور شجاعت کا تصور بھی بدل دیا کیونکہ اب جسمانی جنگ کی بجائے توپوں اور رائفلوں کے ذریعے دشمن کو ختم کر دیا جاتا ہے۔

لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ تاریخ میں بارود کے استعمال میں انقلابی تبدیلی ہوئی۔ اگرچہ بارود کی ایجاد چینیوں کی تھی مگر یہ اسے آتش بازی کے لیے استعمال کرتے تھے۔عثمانی ترکوں اور یورپ والوں نے توپوں میں استعمال کر کے اسے مہلک ہتھیار بنایا۔ چنانچہ جن سلطنتوں نے اسے استعمال کیا یہ تاریخ میں گن پاوڈر ایمپائرز کہلاتی ہیں۔ کیونکہ باردو پر بادشاہ کی اجارہ داری ہوتی تھی اس لیے اس نے جاگیرداروں کا اقتدار ختم کر کے خود کو بے انتہا طاقتور بنالیا۔

بلند اقبال

ڈاکٹر صاحب آپ نے ٹیکنالوجی کے ارتقاء کا جائزہ لیا۔ اب ہم یہ بھی جاننا چاہیں گے کہ اس کا سماجی، معاشی، سیاسی اور نفسیاتی طور پر انسانی معاشرے پر کیا اثر ہوا؟

مبارک علی

ایجاد کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ ضرورت کی ماں ہوتی ہے۔ اگر اس کی ایجاد ایسے وقت پر ہوئی کہ سوسائٹی کو اس کی ضرورت نہ ہوتو اس صورت میں نہ تو کوئی ایجاد ہوتی ہے اور اگر ہو جائے تو اس کا استعمال نہیں ہوتا۔ اس سلسلے میں آپ کو کچھ تاریخ سے مثالیں دینا چاہوں گا مثلاً رومی سلطنت میں جہاں شاندار اور بلند و بالا عمارتوں کا سلسلہ تھا ان کی تعمیر کے لیے پہاڑوں سے بڑی بڑی چٹانوں کو کاٹ کر لایا جاتا تھا۔ یہ بڑا مشقت کا کام تھا۔ ان چٹانوں کو رسوں سے باندھ کر کئی سو افراد گھسیٹتے تھے اس کو دیکھتے ہوئے ایک شخص نے ایک ایسی مشین ایجاد کی کہ جس کے پہیوں کے ذریعے چٹانوں کو آسانی سے لایا جاتا

تھا۔ جب اس نے بڑے فخر سے اپنی اس ایجاد کا تذکرہ رومی شہنشاہ سے لیا تو وہ بجائے خوش ہونے کے ناراض ہوا کہ اس کی اس ایجاد کی وجہ سے ہزاروں مزدور بے روزگار ہو جائیں گے۔ رومی سلطنت ہی میں ایک بڑا واقعہ اس وقت پیش آیا جب ایک شخص نے شیشے کا گلاس تیار کرنے کے لیے ایسی مشین کی ایجاد کی جو ایک وقت میں کئی شیشے کے گلاس تیار کر دیتی تھی۔ رومی شہنشاہ نے اس پر بھی ناراضی کرتے ہوئے نہ صرف گلاس کو توڑ دیا بلکہ اس کے موجد کو قتل بھی کرا دیا کہ وہ لوگوں کی بے روزگاری کا باعث ہوتا۔

اس قسم کا ایک واقعہ ملکہ الزبتھ کے دور میں اس وقت پیش آیا جب ایک شخص نے سینے کی مشین ایجاد کی اور اس کے Patent کے لیے درخواست دی تو ملکہ نے ناراض ہو کر اس کو رد کر دیا کیونکہ یہ کاریگروں کو بے روزگار بنانے کا سبب ہوتی لہٰذا جب ایجاد کی ضرورت نہ ہو تو ذہن اور ایجاد کرنے والے موجد ناکام ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا جب سیاسی، سماجی، معاشی اور نفسیاتی طور پر ایجادات کی ضرورت ہوتی ہے تو اس وقت انہیں خوش آمدید کہا جاتا ہے۔

صنعتی انقلاب نے ٹیکنالوجی کے تصور کو بدل ڈالا فیکٹریوں کی بنیادیں پڑیں صنعتوں کی پیداوار کے لیے مشینوں کا استعمال بڑھا تو اس وقت ایک خیال تو یہ تھا کہ یہ مشینیں انسان کو محنت سے آزاد کریں گی اور بہت سے ایسے غلیظ کام جو انسان کو کرنے پڑتے ہیں۔ اب مشینوں سے لیے جائیں گے اور جب انسان کو محنت سے فراغت ملے گی تو وہ اپنا وقت کتابیں پڑھنے اور موسیقی سننے میں گزارے گا۔ لیکن انسان کا یہ ایک خواب ہی رہا کیونکہ مشینوں نے انسان کو مزید مصروف کر دیا اور فیکٹری میں کام کرنے والے مزدوروں کو یہ احساس ہوا کہ یہ مشینیں ان کی جگہ لے رہی ہیں اور آہستہ آہستہ انہیں بے روزگار بنا رہی ہیں لہٰذا اس کے نتیجے میں انگلستان میں مزدوروں کی ایک تحریک چلی جو Lollord کہلاتی تھی۔ انہوں نے فیکٹریوں میں مشینوں کو توڑنا شروع کر دیا لیکن ان کی یہ تحریک کامیاب نہ ہو سکی کیونکہ سرمایہ دارانہ نظام میں ان مشینوں کی ضرورت تھی جو پیداوار کو بڑھا سکیں اور ان کے

سرمائے میں اضافہ کرسکیں۔ نئ نئ مشین بنتی گئی ٹیکنالوجی میں اضافہ ہوتا گیا اور ان مشینوں کو چلانے کے لیے انجینئرز اور مستریوں کا طبقہ وجود میں آ گیا۔ یہ ٹیکنالوجی کی انسان پر فتح تھی۔

بلند اقبال

ڈاکٹر صاحب اب میں موضوع ذرا دوسری جانب لے جاتا ہوں۔ اس وقت دنیا دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے ایک جدید اور ترقی یافتہ اور دوسری پسماندہ۔ ان دونوں دنیاؤں کے درمیان بڑا فرق ہے۔ یورپ اور امریکہ نے ارتقائی طور پر ترقی کی ہے۔ اس لیے ٹیکنالوجی ان کی زندگی کے ساتھ ساتھ چلی اگر آج ہم اس جدید اور ترقی یافتہ ٹیکنالوجی کو پسماندہ ملکوں میں بغیر کسی ارتقائی عمل کے روشناس کرا دینگے تو کیا وہ اس کو برداشت کرسکیں گے مجھے ہیڈل کا یہ قول یاد آتا ہے کہ اگر وقت کی سوئی کو ماضی میں لے جائیں اور دیکھیں کہ تاریخ میں قوموں نے کیا کیا غلطیاں کی ہیں تو کیا اس صورت میں یہ ممکن ہے کہ ہم ان غلطیوں سے بچ سکیں؟

مبارک علی

اچھا آپ کی یہ بات درست ہے کہ یورپ اور امریکہ میں ٹیکنالوجی کا استعمال ارتقائی مراحل میں ہوا اور چونکہ اس کی ایجادات بھی وہیں پر ہوئیں۔ اس لیے وہ ٹیکنالوجی کے عمل اور کردار سے بخوبی واقف تھے اور اس کا استعمال بھی معمول کے مطابق رہا لیکن تیسری دنیا کے ممالک جن میں خاص طور پر پاکستان بھی شامل ہے جہاں ٹیکنالوجی ارتقائی مراحل میں نہیں آئی بلکہ مکمل شکل میں آئی اس لیے اس کا تضاد ہمارے رویوں اور ہماری روایات اور عادات سے ہوا۔ اس لیے اس ٹیکنالوجی کو اور زیادہ پسماندہ بنا دیا اور اسے قدامت پرست اور فرسودہ روایات اور اداروں کے استحکام کے لیے استعمال کیا۔ جیسے ہمارے ٹی وی چینلز عوام کو باشعور بنانے کے بجائے جہالت پھیلا رہے ہیں اس قسم کا استعمال

ہم کمپیوٹر اور موبائل فون کے ذریعے کر رہے ہیں۔

بلند اقبال

یہاں درمیان میں مَیں ایک سوال اور کرنا چاہوں گا کہ کیا ٹیکنالوجی اور سامراج کے باہمی رشتے سے دنیا کس طرح متاثر ہوئی ہے

مبارک علی

یورپ میں صنعتی انقلاب نے پیداوار میں اضافہ کیا۔ جب پیداوار ان کی مقامی منڈیوں کی کھپت سے زیادہ ہوئی تو اس کے لیے یہ لازمی ہوا کہ زائد پیداوار کے لیے بیرونی منڈیاں تلاش کی جاتیں اس نے یورپی سامراج کو پیدا کیا۔ مثلاً ہندوستان کی کپڑے کی صنعت دنیا بھر میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ تھی لیکن جب انگلستان میں لنکا شائر، برمنگھم اور مانچسٹر میں کپڑے کے کارخانے قائم ہوئے تو ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت نے ہندوستان کے کپڑے کی صنعت کو ختم کر کے یہاں انگلستان کا بنا ہوا کپڑا منڈیوں میں فروخت کے لیے مہیا کر دیا، لہٰذا اس صنعتی انقلاب نے نو آبادیات کو خام مال پیدا کرنے کا ذریعہ بنایا اور اپنا تیار مال بیچ کر منافع کمایا یہ وہ منافع تھا کہ جس کی بنیاد پر یورپ نے مزید نئی ایجادات کیں اور ٹیکنالوجی میں اضافہ کر کے ہم پر برتری حاصل کی لی۔

بلند اقبال

ڈاکٹر صاحب ایک بار پھر سوال کرنا چاہوں گا کہ ایک جانب ارتقائی عمل ہے جو آہستگی کے ساتھ وقت کے تقاضوں کے مطابق ہو رہا ہے۔ تو دوسری جانب ہم کسی تیز سواری پر بیٹھ کر یا ایلیویٹر کو استعمال کر کے بغیر رکے اوپر چلے جائیں گے اور درمیان میں کہیں نہیں رکیں گے تو یہ عمل کس طرح ہم پر اثر انداز ہوگا؟

مبارک علی

آپ کے اس سوال کے جواب میں میں یہ کہوں گا کہ ایسا کوئی عمل جس کے لیے ذہنی طور پر تیاری نہ کی گئی ہو اور وہ اچانک رونما ہو جائے تو یہ انتشار کا باعث ہوگا۔ اس طرح سے اگر کوئی اچانک تبدیلی آ جائے اور ہم اس کے لیے تیار نہ ہوں تو وہ بھی کنفیوژن کا سبب ہوگی اس کی ایک مثال میں دینا چاہوں گا کہ پاکستان میں کاتبوں اور خوشنویسوں کا خوشحال پیشہ کتابوں کی اشاعت میں اہم حصہ لیتا تھا لیکن اچانک کمپوٹر آیا اور اس کے ذریعے کمپوزنگ کا سلسلہ شروع ہوا تو کاتبوں کے گاؤں کے گاؤں بے روزگار ہوگئے اب اگر پہلے سے انہیں اس کا علم ہوتا تو وہ آسانی سے کتابت سے کمپوزنگ کی طرف جا سکتے تھے۔

بلند اقبال

اب میرا سوال یہ ہے کہ اس وقت جس طرح سے NET کا استعمال ہو رہا ہے اور سوشل میڈیا نے جس طرح سے لوگوں کو الجھا دیا ہے کہ اب وہ انسانوں کے بجائے مشینوں سے بات کرتے ہیں۔ انہی کے درمیان رہنا پسند کرتے ہیں اور اپنے اردگرد کے ماحول سے بے خبر ہیں۔ یہ کس طرح سے ہمارے ذہن، نفسیات اور ہمارے رویوں کو متاثر کر رہی ہے۔ آجکل کی اصطلاح میں یہ ذومبی (Zombies) خود کس طرف جا رہے ہیں اور سوسائٹی کو کس طرف لے جا رہے ہیں؟ Internet کے ذریعے یہ لوگ اپنی فرسٹریشن کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور مصنوعی دنیا میں رہ کر خود کو محفوظ سمجھتے ہیں۔

مبارک علی

اس سلسلے میں پاکستانی سوسائٹی کے بارے میں بات کروں گا کہ کیا وجہ ہے کہ لوگ انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کی جانب جا رہے ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ہمارے تعلیمی اداروں میں نصاب بدل گیا ہے۔ اب طالب علم فلسفہ، ادب، تاریخ اور دوسرے سماجی علوم

کے بجائے۔ آئی ٹی کی تعلیم وتربیت کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ کیونکہ مارکیٹ میں اسی کی مانگ ہے اس لیے اس وقت جتنے بھی نجی ادارے ہیں اور یونیورسٹیاں ہیں وہاں سماجی علوم کی کوئی نظیر نہیں ہے۔ اس لیے محض ٹیکنالوجی کی تعلیم حاصل کر کے ذہن میں انسانی احساسات اور جذبات ختم ہو جاتے ہیں۔ بقول اقبال:

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

دوسری وجہ جو نوجوانوں کو انٹرنیٹ کی جانب لے جاتی ہے وہ سماج اور ان کی تفریح کے تمام دروازے بند ہیں۔ نہ موسیقی کی محفلیں ہیں نہ کھیلوں کے مقابلے اور نہ ہی اہل علم سے مکالمے کے مواقع، تفریح کے اسباب کے نہ ہونے کی وجہ سے ان کی دلچسپی کا مرکز انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا ہو جاتا ہے۔ جہاں وہ اپنے دوست بھی تلاش کرتے ہیں اور پیغامات کے ذریعے دل کی بھڑاس بھی نکالتے ہیں۔

بلند اقبال

ڈاکٹر صاحب میں آپ سے یہ سوال کرنا چاہوں گا کہ موجودہ صورت حال میں وقت کے تقاضوں کو دیکھتے ہوئے کیا ضروری نہیں ہے کہ ہم نئے ادارے اور روایات قائم کریں؟ کیونکہ اس وقت ہم جس سماجی اور نفسیاتی انتشار کا شکار ہیں کہ دنیا میں ہمیں کوئی اپنا دوست نظر نہیں آتا اور ہم اپنی ساری توانائی انٹرنیٹ پر صرف کر دیتے ہیں۔ کسی بھی موضوع کی روایاتی تحقیق کے بجائے ہم نیٹ سے مواد نکال کر خوش ہو جاتے ہیں کہ ہم نے تمام علم حاصل کر لیا ہے۔ ہم اس وقت جس صورتحال سے دو چار ہیں اس سے ہماری فرسٹریشن، ذہنی دباؤ اور ذہنی کنفوژن صاف نظر آتی ہے اور ہم اس خام خیال میں مبتلا ہیں کہ اس کا علاج ٹیکنالوجی میں ہے۔

مبارک علی

آپ کے سوال کا جواب یہ ہے کہ ٹیکنالوجی کے استعمال سے آج کے سماج پر جو اثرات ہو رہے ہیں اس کا تجربہ ہم روز مرہ کی زندگی میں کرتے ہیں مثلاً موبائل فون کا استعمال کسی محفل میں اگر لوگ بیٹھے ہوئے ہیں تو بجائے اس کے کہ وہ گفتگو میں حصہ لیں ان کی نظریں اپنے موبائل کی اسکرین پر ہوتیں ہیں۔ جہاں وہ پیغامات کا تبادلہ کر رہے ہوتے ہیں میں جب بھی کوئی لیکچر دے رہا ہوتا ہوں تو سامعین سے کہتا ہوں کہ موبائل بند کر دیں۔ مگر اس کا اطلاق کم ہی ہوتا ہے۔ عام پبلک لیکچرز کے درمیان میں موبائل بجتے رہتے ہیں اور دوسروں کو ڈسٹرب کرتے رہتے ہیں۔

ہمارے ملک میں اشرافیہ کے گھروں میں ہر فرد کے لیے علیحدہ کمرہ ہوتا ہے وہیں اس کا ٹی وی اور لیپ ٹاپ ہوتا ہے جہاں ہر شخص سے تعلق ختم کر کے اس نے اپنی دنیا بسائی ہوتی ہے۔ یہاں فیس بک کا بھی استعمال بڑا دلچسپ ہے۔ جہاں ہر شخص لمحہ بہ لمحہ اپنا سٹیٹس بیان کرتا ہے۔ یعنی اب ہوٹل میں کھانا کھا رہا ہے۔ یا اپنے دوست کے ساتھ چائے پی رہا ہے یا کلاس اٹینڈ کر رہا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کی نجی باتوں کو فیس بک پر شیئر کرنا سمجھ سے باہر ہے۔ لیکن اس کا ایک استعمال اور بھی ہو رہا ہے اور یہ استعمال ہے مذہبی انتہا پسندی کا، فرسودہ سیاسی خیالات کا اور متعصّبانہ جذبات کا۔

بلند اقبال

نیٹ کے سیاست اور مذہبی انتہاء پسندی پر کیا اثرات ہو رہے ہیں؟

مبارک علی

سیاست اور مذہبی انتہاء پسندی دونوں ہی کی نیٹ کے ذریعے تشہیر کی جاتی ہے اور یہ عمل صرف ہمارے ملک تک ہی نہیں بلکہ یورپ اور امریکہ بھی اس سے مبرا نہیں ہیں اور

سیاسی جماعتیں اپنے پیغامات اور منشور کو پھیلانے کی کوشش کرتیں ہیں اس وقت بہت سی انتہا پسند تنظیمیں نوجوانوں کو راغب کرتیں ہیں کہ ان کے ساتھ شامل ہوں اور ان کے پروگرام کو عملی جامہ پہنائیں۔ نیٹ کی خصوصیت کے ساتھ وہاں اہمیت ہو جاتی ہے کہ جہاں آمرانہ بادشاہوں کا نظام ہے اور جہاں لوگوں کو کھُل کر بات کرنے کی یا تنقید کرنے کی اجازت نہیں، وہاں نیٹ لوگوں کو یہ موقع دیتا ہے کہ وہ آمرانہ نظام پر تنقید کر سکیں اور لوگوں میں اپنے خیالات پھیلا سکیں، کیونکہ جب بھی سنسر شپ ہوگا اور پابندیاں ہوں گی تو لوگ اپنی بات کہنے کا راستہ نکالیں گے۔ اس وقت پاکستان میں لوگ نیٹ کے ذریعے لطیفوں اور مزاحیہ جملوں کے ساتھ حکمران طبقوں پر تنقید کرتے ہیں اور اس لیے اب پاکستانی حکمران سوشل میڈیا پر چیک لگانے کی ترکیبیں کر رہے ہیں۔

اس لیے جہاں تک ٹیکنالوجی کے استعمال کا تعلق ہے اس کا دارومدار سوسائٹی کی تعلیم اور تربیت پر ہے کہ کیا وہ ٹیکنالوجی کے ذریعے نئے خیالات و افکار پھیلا کر سماج کو ترقی کی جانب لے جائیں گے یا اس کے ذریعے فرسودہ روایات کو اور زیادہ مضبوط کر کے سوسائٹی کو پسماندہ بنائیں گے۔

بلند اقبال

ڈاکٹر صاحب یہاں پر مجھے ہیگل کی یہ بات یاد آئی کہ اس نے ایک بار کہا تھا کہ اگر ہمارے موجودہ ادارے، روایات، رسم و رواج اور مذہب جن کا ہماری زندگی میں اہم کردار ہے اگر یہ سب ختم ہو گئے اور دنیا سے مٹ گئے تو پھر ان کی جگہ کون لے گا۔ کیا یہ انٹرنیٹ اس کا متبادل ہوگا؟ کیا یہ ہماری مادی اور روحانی ضرورت کو پورا کرے گا۔ کیونکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہماری نوجوان نسل چاہے وہ مغرب میں ہو یا مشرق میں انٹرنیٹ سے اس طرح جُڑ گئی ہے کہ اپنے اردگرد کے ماحول سے بے خبر ہوگئی ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ آخر ہم کس طرف جا رہے ہیں؟

مبارک علی

آپ کا یہ سوال بہت اہم ہے کہ کیونکہ ہم اپنی روزمرہ کی زندگی میں ٹیکنالوجی سے آنے والی تبدیلیوں کو دیکھ رہے ہیں دراصل سائنس اور ٹیکنالوجی میں بہت فرق ہے سائنس کا تعلق فلسفے سے ہے اور ایک سٹیج پر جا کر وہ فلسفیانہ روایات سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے لیکن ٹیکنالوجی کا تعلق نہ سائنس سے ہے اور نہ سماجیات سے اور نہ ہی عقائد، اخلاقی اقدار اور رسم و رواج سے اس لیے اس کا استعمال اور اس کو استعمال کرنے والا ٹیکنیشن کی مانند ہوتا ہے۔ اب مفکرین اور دانشمند ٹیکنالوجی سے پیدا ہونے والے نتائج پر غور تو کر رہے ہیں مگر جو اس کا استعمال کرتے ہیں وہ ان مفکرین کے اقتدار و خیالات کی پرواہ نہیں کرتے ہیں۔ مثلاً جاپان جیسے ترقی یافتہ ملک میں ایسے نوجوان ہیں جو دنیا سے تعلق چھوڑ کر کمرے میں بند انٹرنیٹ سے اپنا رشتہ جوڑے ہوئے ہیں۔ اس لیے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دنیا اسی طرح سے تبدیل ہوئی تو پھر زندگی کا کیا مقصد رہ جائے گا۔ کیونکہ اب تک فلسفی اور مذہبی رہنما اسی سوال کا جواب ڈھونڈ رہے ہیں کہ انسان کیوں پیدا ہوا اور کس مقصد کے لیے زندگی گزاری، کیا محض اپنی ذات کے لیے یا معاشرے کے لیے ٹیکنالوجی کے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں ہم دیکھ رہے ہیں کہ انسان نہ صرف زندگی کا مقصد کھو رہا ہے بلکہ اپنی آزادی کو بھی ٹیکنالوجی کے ہاتھوں قربان کر رہا ہے۔

بلند اقبال

ڈاکٹر صاحب آپ کا شکریہ میں یہی دیکھ رہا ہوں کہ ٹیکنالوجی کس طرح ہماری زندگی کو بدل رہی ہے کیونکہ اگر آپ ایک کمرے میں بیٹھے ہوئے کسی ادارے میں ملازمت بھی کر سکتے ہیں۔ شاپنگ بھی کر سکتے ہیں سنیما، تھیٹر یا ریلوے کے ٹکٹ بھی خرید سکتے ہیں۔ یعنی اب انسانوں سے تعلق رکھے بغیر آپ تقریباً ہر کام آن لائن کر سکتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ سماجی رشتے ٹوٹ رہے ہیں ہماری گفتگو کا انداز بدل رہا ہے۔ زبان میں استعمال

ہونے والے الفاظ بدل رہے ہیں اور ہم ایک ایسی دنیا بنارہے ہیں کہ جہاں ہم ہونگے یا انٹرنیٹ۔

مبارک علی

جی ہاں ٹیکنالوجی ہمیں اجنبی بنارہی ہے اس نے فطرت سے ہمارے رشتے ختم کر دیئے ہیں اور وہ خوشی اور مسرت جو کھلی فضاء سرسبز وشاداب درخت و پودے دیتے تھے وہ دور ہوتے جارہے ہیں۔

بلند اقبال

ڈاکٹر صاحب اس وقت اس بات کی ضرورت ہے کہ اس صورت حال میں ہم نئے ادارے بنائیں اور نئی راہیں تلاش کریں تاکہ ہماری زندگی کا کوئی مقصد ہو۔ میں ایک بار پھر آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ ہمیں وقت دیتے رہتے ہیں۔

☆......☆......☆

7-قدیم تہذیبیں اور ان کی دریافت (حصہ اوّل)

بلند اقبال

آج کے موضوع کا تعارف میں ابن خلدون کا حوالہ دینا چاہوں گا جس نے تہذیبوں کے عروج و زوال کے بارے میں یہ نظریہ دیا کہ قومیں حملہ آور ہو کر علاقوں پر قبضہ کرتی ہیں پھر اپنے اقتدار کو مستحکم کرتیں ہیں۔ اس کے بعد زوال پذیر ہوتیں ہیں اور ان کی جگہ دوسری اقوام آ کر اس سلسلے کو دہراتی ہیں۔ ناظرین میں یہاں یہ ذکر بھی کرنا چاہوں گا کہ ایک وقت تک دنیا کو قدیم تہذیبوں کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا۔ چینی تہذیب کو یا میسوپوٹامیہ کی مصر کی یا یونان اور روم کی یہ سب دنیا سے اوجھل تھیں، ایران نے ایک وسیع و عریض سلطنت کی بنیاد ڈالی مگر اس کے کارنامے بھی اندھیرے میں ڈوب گئے لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ ان تہذیبوں کے خیالات و افکار اور ادب کی نشانیاں کسی نہ کسی صورت میں باقی رہیں اور آنے والے اہل علم ان سے سیکھتے رہیں۔ ایسے ہی جیسا کہ آج کل ہم مغربی تہذیب سے سیکھ رہے ہیں۔ آج کے اس موضوع پر گفتگو کے لیے ڈاکٹر مبارک علی ہمارے ساتھ ہیں میں ان کا تہہ دل سے مشکور ہوں اور ہمیں ضرورت اس بات کی ہے کہ تاریخ کو دلیل اور عقل کی بنیاد پر سمجھیں۔

مبارک علی

مجھے خوشی ہے کہ آپ نے بھی اس موضوع پر گفتگو کی دعوت دی کیونکہ ہمارے

ہاں عام طور سے لوگوں کو قدیم تہذیبوں کے بارے میں بہت کم علم ہے اس کی وجہ ہمارا نظام تعلیم ہے جس کا نصاب جدید تحقیق کی بنیادوں پر نہیں ہے۔اس لیے ہم بہت سے مفروضوں پر یقین کر لیتے ہیں اور حقیقت جاننے کی کوشش نہیں کرتے ہیں۔

بلند اقبال

ہمارے ہاں یہ رواج ہے کہ کچھ جملے اور کچھ باتیں کہہ دی جاتیں ہیں اور لوگ ان پر یقین کر کے دہراتے رہتے ہیں۔انہیں میں سے ایک بات اکثر کہی جاتی ہے کہ اسلام سے پہلے جاہلیت کا دور دورا تھا اس کا تجزیہ ہم کس طرح سے کریں گے۔

مبارک علی

دراصل جاہلیہ کے لفظ کے معنی کو ہم یہ سمجھ کر استعمال کرتے ہیں کہ اسلام سے پہلے تہذیبوں کا کوئی وجود نہیں تھا۔انگریزی میں اس کے لیے (IGNORANCE) ناواقفیت کا لفظ استعمال کیا جاتا تھا، اس کا مطلب یہ تھا کہ تہذیبوں کا وجود تو تھا لیکن دنیا ان سے ناواقف تھی۔ کیونکہ وہ زمین میں مدفون تھیں اور ان کے آثار کبھی دریافت نہیں ہوئے تھے۔ دوسرا جاہلیہ کو ان معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے کہ اسلام سے پہلے دوسرے مذاہب فرسودہ ہو چکے تھے۔اور اسلام نے دنیا کو ایک نئی روشنی دی اور جہالت سے نکالا۔

لیکن ہمیں اس موضوع کو وسیع تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے کیونکہ اٹھارویں صدی میں تہذیبوں کی دریافت کے بعد میسوپوٹامیہ مصر سے وادی سندھ، چین، ایران، یونان اور روم کی تہذیبیں دریافت ہوتیں ہیں جنہوں نے ہمارے علم کو وسیع کر دیا ہے۔ان دریافتوں سے ہمیں یہ پتہ چلا کہ یہ تہذیبیں ارتقاء کے کن مراحل میں تھیں، ان کے مذہب، زرعی نظام، ٹیکنالوجی زبان اور ان کا رہنا سہنا ان کے استعمال میں ہونے والے اوزار اور ہتھیار۔ ان کے تہوار، رسم و رواج فن تعمیر، مصوری اور عام لوگوں کی روزمرہ زندگی کے بارے میں علم ہو۔خاص بات یہ ہے کہ بہت سے اوزار حادثاتی طور پر دریافت ہوئے۔کہیں

آب پاشی کے لیے کنواں کھودا گیا تو اس کے نیچے شہر برآمد ہوگیا۔ جیسے اٹلی کے شہر پنپلز میں، ہرکیلین کا شہر اس طرح سے دریافت ہوا۔ چین میں ایک کھیت میں کھودائی کے درمیان ہان خاندان کے شہنشاہ کا مقبرہ اور اس کی حفاظت میں بنائی گئی مٹی کی فوج ملی۔ اس کے بعد آثارِ قدیمہ کو مذہب اور قوم پرستی کے لیے بھی استعمال کیا گیا۔ ان دریافتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ قدیم تہذیبیں جو زمین میں مدفون تھیں وہ اُبھر کر سامنے آ گئیں۔

بلند اقبال

ڈاکٹر صاحب یہاں میں آپ سے میسوپوٹامیہ کی تہذیب کے بارے میں سوال کرنا چاہوں گا کہ اس کی کیا اہمیت تھی؟

مبارک علی

میسوپوٹامیہ جن کے مغربین دو دریاؤں کی تہذیب یہاں پر چار تہذیبیں عراق کے مختلف حصوں میں ارتقاء پذیر ہوتیں۔ سب سے پہلی تہذیب سمیری تھی۔ اس کی ترقی کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اس میں شہر آباد ہوگئے تھے ان شہروں میں اُرُک، لاگاش، نینوا اور اُر قابلِ ذکر تھے۔ ریاست کا دور آچکا تھا۔ بادشاہت کا دور تھا زراعت میں ترقی ہو چکی تھی۔ کئی دیوی دیوتاؤں کو لوگ پوجتے تھے۔ ان میں اُشتر دیوی جو محبت اور جنگ کی دیوی تھی اس کا شاندار مندر تھا دوسرے دیوتاؤں کے لیے انہوں نے بُلند و بالا پلیٹ فارم تعمیر کرائے تھے جو ذغورت کہلاتے تھے مقصد یہ تھا کہ دیوتا بلند و بالا جگہ پر ہیں، انہوں نے رسم الخط بھی ایجاد کر لیا تھا جو خط میخی کہلاتا ہے جو مٹی کی تختیوں پر لکھا جاتا تھا۔ انہی تختیوں پر لکھی ہوئی گلگامشین کی داستان بھی ملی ہے۔ سمیری تہذیب کے بعد دوسری تہذہب کلدانی تھی اور تیسری اسیری جس نے ایک بڑی سلطنت کو قائم کیا۔ اس کے بعد بابلی تہذیب آتی ہے جس کے حکمران حمودابی نے پہلی مرتبہ قوانین کا ایک مجموعہ دیا۔ لہٰذا مشرق وسطی پر میسوپوٹامیہ کی ان تہذیبوں کا گہرا اثر ہوا۔ مثلاً میں یہاں یہ ذکر بھی کر دوں کہ ان کے مذہبی عقائد میں

شیطان کا لفظ استعمال ہوا ہے جو شر اور بدی کی علامت تھا۔ یہاں میں یہ ذکر بھی کر دوں کہ بابل کی تہذہب اپنے وقت کی انتہائی ترقی یافتہ شکل اختیار کر گئی تھی۔ یونانی مورخوں نے یہاں (Hanging Gardens) یا معلق باغات کا ذکر کیا ہے کہ جو پھیلے ہوئے پلیٹ فارمز پر واقع تھے اور جنہیں میکانکی آلات سے پانی دیا جاتا تھا۔ حال ہی میں آثارِ قدیمہ کے ماہرین نے اس جگہ کو دریافت کیا ہے جہاں یہ باغات تھے لہٰذا ان چاروں تہذیبوں نے علم و ادب قوانین، خونریز جنگوں اور سخت گیر بادشاہت کے نظام کو پیدا کیا۔ ان تہذیبوں کے بارے میں ہماری معلومات میں اس لیے اضافہ ہوا کہ ہم نے ان کے رسم الخط کو پڑھ لیا گیا۔

بلند اقبال

میسوپوٹیمیا کے بعد آپ سے التماس کروں گا کہ مصری تہذیب پر بھی روشنی ڈالیے۔

مبارک علی

مصری تہذیب میسوپوٹیمیا کی ہم عصر ہے۔ اس تہذیب کی نمایاں علامات اہرام مصر ہیں جو ہزاروں برس سے صحرا میں کھڑے مصری تہذہب کی یاد دلاتے رہے ہیں۔ لیکن یہ تہذیب اس وقت دریافت ہوئی۔ جب نپولین نے 1798ء میں مصر پر حملہ کیا اور اپنے ساتھ تقریباً ڈیڑھ سو کے قریب ماہر آثار قدیمہ مورخ ماہر لسانیات انجینئرز اور دوسرے ماہروں کو لے کر آئے۔ انہوں نے باقاعدہ مصر کی تہذیب کا جائزہ لیا مواد جمع کیا۔ قدیم نوادرات حاصل کئے۔ بعد میں ان ماہرین نے مصر کی تہذیب پر کئی جلدوں میں اپنی تحقیق کے نتائج شائع کئے۔ جو نوادرات دریافت ہوئے تھے وہ پیرس کے میوزیم میں موجود ہیں۔ اس مہم کا کارنامہ یہ ہے کہ جب دریافت کے دوران ایسا کتبہ ملا جو تین زبانوں میں تھا۔ ہیرو غلامی جو مصر کی قدیم اور مقدس زبان تھی ڈیموٹک جو کہ عام لوگوں کی زبان تھی اور یونان، یہ کتبہ روزیٹا کہلاتا ہے۔ ایک فرانسیسی افسر شیپلوں نے 14 سال کی محنت کے بعد یونانی زبان

کی محنت سے مصر کا قدیم رسم الخط دریافت کیا۔اس دریافت نے مصر کی قدیم تاریخ کو اہل علم کے لیے کھول دیا۔جب ماہر آ ثار قدیمہ نے مزید دریافتیں کیں تو رسم الخط کی مدد سے مصر کی تاریخ کو مرتب کر لیا گیا۔

مصر کی تہذیب کی جو خصوصیات ہیں ان میں سب سے اہم اہرام مصر کی تعمیر ہے جو انجینئرنگ اور فنِ تعمیر کی پختگی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ابتداء میں جب ریگستان میں اہرام مصر بنانے کی کوشش کی گئی تو وہ ریت میں دھنس گئے۔لہٰذا بعد میں پہلے ایک پلیٹ فارم تیار کیا گیا اور بعد میں اس کے اوپر اہرام تیار کئے گئے۔اس وقت دو مشہور اہرام ہیں۔ایک سیڑھیوں والا اور دوسرا بغیر سیڑھی والا۔بادشاہوں کے علاوہ امراء اور عورتوں کے اہرام بھی ہیں جو سائز میں چھوٹے ہیں،مصر میں لوگوں کا عقیدہ یہ تھا کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہوں گے۔اس لیے ان اہراموں میں بادشاہ کو کئی تابوتوں میں رکھ کر ان کو ایک کمرے میں رکھ کر محفوظ کر دیا جاتا تھا اور اس کے ساتھ اس کا خزانہ کھانے پینے کی اشیاء اور ملازمین کو بھی دفن کر دیا جاتا تھا۔جب چوروں نے ان مقبروں سے اشیاء کو لوٹنا شروع کیا تو پھر اہراموں کی بجائے ''بادشاہوں کی وادی'' میں ان کو زمین دوز مقبروں میں خفیہ دفن کیا جانے لگا۔اہرام مصر اور مقبرے کی دریافت نے مصر کے قدیم نوادرات اور دولت کو دنیا بھر کے میوزیم کے لیے بیش بہا خزانہ بنا دیا ہے۔دوسری اہم خصوصیت مصری تہذیب کی اس عقیدے پر ہے کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندگی ہوگی۔لہٰذا مردہ جسم کو ممی بنانے کا عمل بھی مصر میں شروع ہوا تا کہ مردہ جسم اپنی اصلی حالت میں رہے۔ممی بنانے کے فن نے علم طب اور فن جراحت میں مصر کی مہارت کا ثبوت دیا۔مصر کی تہذیب کا ایک اہم تحفہ پیائرس کی دریافت ہے۔جو کاغذ سے پہلے لکھنے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔مصر کی تاریخ میں انقلابی دور اس وقت آیا جب اس کے ایک فرعون جس کا نام اخنطون تھا،اس نے مصر کے قدیم مذہب سے انحراف کرتے ہوئے ایک خدا کا تصور پیش کیا اور اپنا دارالحکومت بھی بنایا۔جس پر قدیم مذہب کے پجاری سخت ناراض ہوئے اور اس کے مرنے کے بعد دوبارہ سے پرانے مذہب کو نافذ کیا۔

مصر کی تاریخ کے حوالے سے میں یہ ذکر کرنا چاہوں گا کہ اس پوری تاریخ میں کہیں بھی حضرت یوسف کا کوئی ذکر نہیں ہے۔شاید یہ واقعہ مصریوں کے لیے اہم نہ ہو۔اس طرح سے یہودیوں کی ہجرت اور انکا سمندر کا سفر طے کر کے ریگستان میں جانا یہ بھی مصر کی تاریخ میں نہیں ہے۔سیگمنڈ فرائڈ نے حضرت موسیٰؑ اور وحدانیت پر ایک کتاب لکھی ہے۔اس کا کہنا یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ یہودی نہیں تھے بلکہ ان کا تعلق فرعون کے شاہی خاندان سے تھا۔چونکہ ان کے پیغام کو وہاں آباد یہودیوں نے مان کیا اس لیے انہوں نے ان کی راہنمائی کی۔ بعد میں یہودیوں نے اپنی تاریخ میں ہجرت کے واقعے کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔اس وقت ہمارے پاس مصر کی تہذیب کا کافی مواد موجود ہے۔جس کی بنیاد پر ہم اس تہذیب کے کارنامے اور اس کی تخلیقی صلاحیتوں کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ کیونکہ آنے والی تہذیبوں نے مصر سے بہت کچھ سیکھا۔

بلند اقبال

کیا وادی سندھ کی تہذیب مصر اور میسوپوٹامیہ کی تہذیب کے ہم عصر تھی؟

مبارک علی

میسوپوٹامیہ مصر اور وادی سندھ کی تہذیب میں کانسی کے دور کی تہذیبیں ہیں۔ کانسی کی ایجاد نے پتھر کے اوزار وہتھیار کو تبدیل کیا اور انسانی سماج کو بدلا، کانسی کے دور کی تہذیبوں کے دور کی اہم خصوصیات یہ ہیں کہ اس زمانے میں شہر آباد ہوئے رسم الخط ایجاد ہوا بادشاہ کا نظام آیا، دیوی، دیوتاؤں اور ان کی پوجا کے لیے مندروں کی تعمیر ہوئی، فن تعمیر، مجسمہ سازی، ادب اور کاریگری کے پیشے نے روزمرہ کی زندگی کے لیے آلات اوزار اور برتن بنائے۔ یہ خصوصیات ہم اس دور کی تمام تہذیبوں میں دیکھتے ہیں۔ وادی سندھ کی تہذیب بھی ہزاروں برس سے زمین میں مدفون تھی اور لوگ اس کے وجود سے ناواقف تھے۔ ہڑپہ اور موہنجوڈورو کے ٹیلوں سے گاؤں اور دیہات کو پرانی اشیاء ملتیں رہتی تھیں۔ 1920ء میں

جون مارشل اور ہندوستانی ماہرین نے پہلے ہڑپہ شہر کی کھدائی کی۔ اس وجہ سے اس کو ہڑپہ تہذیب بھی کہا جاتا ہے اس کے بعد موہنجوڈورو کا شہر آباد ہوا جو اپنے ٹاؤن پلاننگ کی وجہ سے اہمیت کا حامل تھا۔ اس کے بعد سے مختلف دریافتوں کے ذریعے وادی سندھ کی تاریخ کے بارے میں نظریات بھی بدلتے رہے۔ مثلاً 1970ء میں جب مہر گڑھ دریافت ہوا جو بلوچستان میں واقع ہے اور تقریباً سات ہزار قبل مسیح کا ہے۔ حال ہی میں ہندوستان میں بھی نئی کھدائیوں کے ذریعے اس تہذیب کے آثار ملے ہیں جو آٹھ ہزار سال قبل مسیح تک جاتے ہیں۔ لہٰذا اس تہذیب کا دائرہ بہت وسیع ہو جاتا ہے۔ یہ مشرقی افغانستان سے چلتی ہوئی بلوچستان آتی ہے۔ بلوچستان سے پنجاب اور پھر چولستان کے راستے جو کہ ایک زمانے میں دریائے لاکھرا کی وجہ سے آباد تھا۔ یہ سندھ میں موہنجوڈورو تک جاتی ہے اور پھر سندھ سے کاٹھیاواڑ، گجرات اور مدیہہ پردیش میں اس کے آثار ملتے ہیں۔ اس لیے ایک تو حیران کن بات یہ ہے کہ اس تہذیب کے پھیلاؤ میں ہمیں کسی جنگوں کا پتہ نہیں چلتا ہے اور نہ ہی یہاں سے مہلک ہتھیار ملے ہیں جو جنگ میں استعمال ہوسکتے تھے۔ لہٰذا یہ وسیع و عریض تہذیب شائد معاشی اور کلچر کی بنیاد پر ایک دوسرے سے جڑی ہوئی تھی۔ کیونکہ اس تہذیب کا رسم الخط نہیں پڑھا گیا اس لیے ہماری معلومات آثار قدیمہ کی دریافتوں پر ہے ان کی مدد سے ہم اس عہد کے معاشرے کی تشکیل کر سکتے ہیں۔ مثلاً ایک بات تو یہ سامنے آتی ہے کہ ان کی سوسائٹی میں تاجروں کی اہمیت تھی جو تجارت کی غرض سے میسوپوٹامیہ اور مصر تک جاتے تھے۔ لیکن خاص بات یہ ہے کہ دولت مند تاجر یا اُمراء نے اپنی دولت کا اظہار نہیں کیا۔

ایک اور اہم خصوصیت اس تہذیب کی یہ تھی کہ ان کے ہاں صفائی کا اعلیٰ معیار تھا۔ گھروں میں غسل خانے ہیں اور بعض گھروں میں کنویں بھی موجود ہیں۔ گندے پانی کے نکاس کے لیے نالیاں ہیں جو ڈھکی ہوئی ہیں۔ ایک بڑا نہانے کا حوض ہے جہاں شائد مذہبی لحاظ سے نہا کر پاک ہوا جاتا تھا۔ ایک بڑا حال ہے جہاں شائد شہر کے لوگ مشاورت کے

لیے جمع ہوتے ہونگے۔ اس تہذیب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں کوئی شاندار مندر، محلات اور عمارتیں نہیں ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ عام لوگوں سے بے گار کا کام نہیں لیا گیا۔ لہٰذا ان خصوصیات کی بنیاد پر وادی سندھ کی تہذیب مختلف اور جداگانہ ہے۔ اگرچہ یہ ہزاروں برس زمین میں دفن رہی لیکن یہ تہذیب کسی نہ کسی شکل میں جاری رہی۔

بلند اقبال

آپ نے وادی سندھ کی تہذیب کا جو ذکر کیا ہے۔ اس سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ہمارے علاقے کی یہ تہذیب کس قدر پرامن تھی جبکہ دوسری تہذیبوں میں جنگ و جدل تھا خونریزی تھی، جبر اور ستم تھا، ڈاکٹر صاحب اب میں چاہوں گا کہ آپ یونان کی تہذیب کے بارے میں بھی کچھ بتائیں۔

مبارک علی

یونان کی تہذیب اور اس کے فلسفے کو ہم دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ پہلے اس کے فلسفے کی ابتداء یونان کی ایک کالونی سے ہوتی ہے۔ جو ایونیا کہلاتی تھی۔ جو اب مغربی ترکی میں واقع ہے۔ اس دور کے فلسفیوں کو نیچرل فلسفی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ انہوں نے اس دنیا کی تخلیق کے بارے میں اپنے نظریات پیش کئے۔ پہلا فلسفی جس کا نام تھیلیز تھا اس نے کہا کہ یہ دنیا پانی سے بنی ہوئی ہے۔ اس کے بعد آنے والے اس کے شاگردوں نے اپنی تحقیق کے ذریعے (جس کی تعداد دو تھی) یہ نظریہ پیش کیا کہ پانی کے ساتھ ساتھ یہ دنیا آگ مٹی اور ہوا سے بنی ہے۔ یعنی ان چار عناصر نے دنیا کی تخلیق کی ہے، ایک اور فلسفی جس کا نام ہیرک لائٹس تھا۔ اس نے یہ نظریہ پیش کیا کہ اس کائنات اور انسانی سماج میں ہر شے متحرک اور بدلتی رہتی ہے۔ چاہے وہ مذہب ہو اخلاقی قدریں ہوں روایات یا ادارے ہوں۔ اس کا یہ بھی کہنا تھا کہ کوئی ایک ہی دریا میں دوسری بار پیر نہیں رکھ سکتا کیونکہ پانی بہتا ہوا نکل جاتا ہے اور پاؤں کے نقش برقرار نہیں رہتے ہیں۔

چھٹی صدی عیسوی کے بعد فلسفے کا رخ بدل جاتا ہے اور چوتھی صدی عیسوی میں اینتھر اس کا مرکز بن جاتا ہے۔ یہاں پر ہمیں سقراط کی اہم شخصیت ملتی ہے۔ اس کے فلسفے کی خاص بات یہ تھی کہ اس نے کائنات اور نیچر سے ہٹ کر انسان اور انسانی سماج کو فلسفے کا موضوع بنایا ہے۔ ارسطو کا طریقہ کار یہ تھا کہ وہ شہر کے چوراہے پر آ کر لوگوں ے سوالات کرتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اسے خود کچھ نہیں آتا ہے۔ بلکہ وہ دوسروں سے سیکھتا ہے۔ اس کے طریقہ کار کی ایک مثال یہ ہے کہ راستہ چلتے ہوئے اسے ایک نوجوان ملتا ہے۔ وہ نوجوان سے پوچھتا ہے کہ یہ بتاؤ کہ روٹی کہاں سے ملے گی؟ نوجوان نے کہا گلی کے نکڑ پر موجود دوکان سے مل جائے گی۔ اس پر سقراط نے دوسرا سوال یہ کیا کہ پنیر کہاں سے ملی گی؟ نوجوان نے کہا اس کی اگلی دوکان سے۔ تیسرا سوال سقراط نے یہ کیا کہ شراب کہاں سے ملے گی۔ اس نے جواب دیا وہ بھی وہیں سے ملے گی۔ پھر سقراط نے نوجوان سے پوچھا کہ نیکی کہاں سے ملی گی؟ اس پر نوجوان تھوڑا سوچ میں پڑ گیا تو سقراط نے کہا کہ میں بتاتا ہوں کہ نیکی کہاں سے ملے گی، تو یہ سقراط کا طریقہ کار تھا۔ سقراط نے اپنی زندگی میں کچھ نہیں لکھا وہ لکھنے کے خلاف تھا۔ کیونکہ اس کا کہنا تھا کہ لکھنے کے بعد اسے بدلا نہیں جا سکتا۔ جبکہ زبانی گفتگو میں ردوبدل ہوسکتا ہے۔ اس لیے سقراط کے فلسفے کی تمام معلومات ہمیں افلاطون کی تحریروں سے ملتی ہے۔

سقراط کا دستور یہ تھا کہ وہ سوالات کرتا تھا کہ انصاف کیا ہے؟ نیکی کیا ہے اور کیونکر انسان خوشی اور مسرت کو حاصل کرسکتا ہے۔ افلاطون نے اپنی کتاب جمہوریت میں سقراط اور دوسرے فلسفیوں کے درمیان ہونے والے مباحثے اور مکالموں کی تفصیل دی ہے۔ افلاطون نے اپنی اس کتاب میں سیاست دانوں پر کڑی تنقید کی ہے۔ کہ یہ اپنے فن خطابت کے زور پر لوگوں کو گمراہ کر کے اپنے مفادات حاصل کرتے ہیں۔ وہ جمہوری نظام کے خلاف تھا کیونکہ اسی جمہوریت میں اس کے استاد سقراط کو سزائے موت ملی تھی۔ افلاطون نے فلسفے کی تعلیم کے لیے اکیڈمی کھولی تھی جہاں ارسطو بیس سال تک اس کے شاگرد کی حیثیت سے تعلیم

حاصل کرتا رہا۔افلاطون کی یہ اکیڈمی رومی عہد میں بھی جاری رہی یہاں تک کہ جب بازنطینی دور میں جسٹینین نے جوعیسائی مذہب میں انتہاء پسند تھااس نے اکیڈمی کو بند کر دیا۔

یونان میں فلسفہ افلاطون اور ارسطو کے بعد نہیں ختم ہوا بلکہ فلسفے کے نئے مکاتب ابھرتے رہے جن میں خاص طور سے ایپی کیورلیس کا فلسفہ اور رواقی فلسفہ قابل ذکر ہے۔ یونان کے فلسفے نے ورثے میں دنیا کو غور وفکر کرنے اور سوچنے کے مواقع دیئے ہیں۔

☆......☆......☆

8- قدیم تہذیبیں اور ان کی دریافت

(حصہ دوئم)

بلند اقبال:

ناظرین پچھلے پروگرام میں ہم نے اسلام سے قبل کی قدیم تہذیبوں کا جائزہ لیا تھا۔ جن میں قدیم میسوپوٹامیہ مصر وادی سندھ اور یونان شامل تھے۔ ہم نے اس بات کا بھی جائزہ لیا تھا کہ علم آثارِ قدیمہ کی مدد سے جب قدیم تہذیبیں گم نامی سے روشنی میں آئیں تو اس نے نہ صرف تاریخ کے علم کو وسعت دی بلکہ یہ بھی اندازہ ہوا کہ انسان نے ذہنی طور پر قدیم عہد میں تخلیقات کے ذریعے اپنے شعور کی پختگی کو ثابت کیا ہم آج یہ دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ ازلی فتوحات سے پہلے اس کی ہمسایہ سلطنتیں کن مراحل سے گزر رہی ہیں اور اسلام کی آمد سے ان میں کیا تبدیلیاں ہوئیں اور یہ سوال بھی اٹھائیں گے کہ کیا قدیم اور عہد وسطی میں یورپ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہمارے ذہنوں میں تاریخ کے بارے میں بہت غلط فہمیاں ہیں، ان غلط فہمیوں کو دور کئے بغیر ہم تاریخ کو پوری طرح سے نہیں سمجھ پائیں گے۔ مبارک علی صاحب میں پھر ایک مرتبہ شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ میرے پروگرام میں تشریف لائے۔ پچھلے پروگرام میں یونان کی تہذیب کا ذکر کر رہے تھے تو کیا آپ اس پر مزید روشنی ڈالیں گے؟

مبارک علی

جی ہاں ہم نے پچھلے پروگرام میں ایتھنز کا ذکر کیا تھا اور خاص طور سے سقراط اور ارسطو کے فلسفے کا مختصراً جائزہ لیا تھا۔ افلاطون کے سیاسی فلسفے اور جمہوریت کے بارے میں اس کے نظریات کو دیکھا تھا اس تسلسل کو جاری رکھتے ہوئے میں کہنا چاہوں گا کہ افلاطون کے بعد اس کے شاگرد ارسطو کا ذکر آتا ہے۔ یہ بیس سال تک اس کا شاگرد رہا مگر اس نے اپنے استاد پر سخت تنقید کی، خاص طور سے افلاطون نے جمہوریت کے نگہبانوں کا فلسفہ دیا تھا۔ جن پر کسی بھی قسم کی تنقید کا حق نہیں تھا۔ اس میں عورتوں کو بھی مردوں کے برابر حق دیا تھا اور جمہوریت کے نگہبانوں کے لیے نجی جائیداد کا رکھنا ممنوع کیا تھا۔ ارسطو نے اس پورے فلسفے پر تنقید کی وہ عورتوں کو مردوں سے کم تر سمجھتا تھا۔ اس کا یہ نظریہ یہودیت، عیسائیت اور اسلام میں بھی آ گیا۔ ان کے فلسفے کا مقصد یہ تھا کہ اس دنیا میں خوشی اور مسرت کے حصول کے لیے سادگی اختیار کرنا چاہیے۔ نجی جائیداد کا حصول نہیں کرنا چاہیے کیونکہ یہ انسان کی زندگی میں رکاوٹیں ڈالتی ہے۔ کم سے کم خواہشات رکھنی چاہئیں۔ یہاں میں خاص طور سے دیوجانس قلبی کا ذکر کروں گا جس کے نزدیک کامیاب زندگی کا مقصد کیا تھا۔ وہ ایران کے ایک جزیرے میں برہنہ رہتا تھا۔ نہ اس کا کوئی خاندان تھا اور نہ کوئی جائیداد، اسکندر اس کی شہرت سن کر جب اس سے ملنے گیا تو وہ لیٹا ہوا دھوپ سیک رہا تھا۔ اسکندر نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ میں اسکندر ہوں۔ بادشاہ ہوں اور فاتح ہوں اس پر اس نے کہا کہ مجھے اس سے کیا۔ اس پر اسکندر بولا کہ کیا تم مجھ سے خوفزدہ نہیں ہو اس پر دیوجانی نے کہا کہ کیا تم شیطان ہو کہ جس سے خوفزدہ ہوا جائے۔ اب اسکندر کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ اس نے صرف یہ کہا کہ مجھے یہ بتایئے میں آپ کے لیے کیا کرسکتا ہوں؟ اس پر دیوجانی نے کہا کہ آپ ذرا دھوپ چھوڑ کر کھڑے ہو جائیں کہتے ہیں کہ جب اسکندر واپس لوٹنے لگا تو اپنے لوگوں سے کہا کہ اگر میں اسکندر نہیں ہوتا تو دیوجانی ہوتا۔ اس کا اپنا اور واقعہ میں آپ کو سناتا ہوں۔ دیوجانی کے پاس مٹی کا پیالہ تھا جس سے وہ پانی پیتا تھا۔ ایک دن اس نے دیکھا کہ

ایک لڑکا دریا میں چلو میں پانی پی رہا تھا۔اس پر اس نے پیالہ بھی توڑ دیا اور کہا کہ جب پانی پینے کا یہ طریقہ ہے تو پیالے کی کوئی ضرورت نہیں۔

اب میں مختصراً ایتھنز کی جمہوریت کا ذکر کروں گا۔اس میں شہریوں کو ووٹ کا حق تھا۔غلام،عورتیں اور غیر ملکی اس حق سے محروم تھے۔اہم فیصلے اسمبلی کے اجلاس میں ہوتے تھے۔جہاں تمام شہری شرکت کرتے تھے،سرکاری عہدیدار فوجی جرنلز اور حکمرانوں کا انتخاب ہوتا تھا۔اگر کوئی سیاستدان یا عہدیدار کرپشن میں ملوث ہوتا تھا تو اسے (10) سال کے لیے جلاوطن کر دیا جاتا تھا۔ایتھنز کی جمہوریت میں قانون کی اہمیت تھی تاکہ معاشرہ منظّم رہے اور جرائم پر قابو پایا جائے۔پہلا مشہور قانون دان ڈریکو تھا جو اپنے سخت قوانین کی وجہ سے مشہور تھا۔دوسرا قانون دان سوکن تھا جس نے عدالتی نظام میں جیوری سسٹم کو متعارف کرایا۔ملزم کو دفاع کا حق دیا اور فیصلے پر اپیل کا بھی۔ان قوانین کی وجہ سے ایتھنز کے شہری مقدمہ باز ہو گئے تھے اور قانون کو اپنے دفاع میں استعمال کرتے تھے۔

بلند اقبال:

ناظرین وقفے کے بعد میں پھر حاضر ہوں۔ابھی مبارک علی صاحب نے ایتھنز میں جمہوری اداروں اور قانون کے بارے میں ہمیں بتایا اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہم آج جس جمہوری نظام اور قانون پر عمل کر رہے ہیں۔اس کی جڑی قدیم یونان کی تہذیب میں تھی اور یہ انہیں روایات کا تسلسل ہے جو تاریخی عمل کے ذریعے ہم تک پہنچا اب میں اس سے ذرا ہٹ کر ریاضی کے بارے میں آپ سے سوال کرنا چاہوں گا کہ یہ ZERO کس کی ایجاد ہے اور کن مراحل سے گزر کر یہ ہم تک پہنچا ہے۔

مبارک علی

آپ نے جو ZERO کی ایجاد کی ہے تو اس کا موجد ہندوستان کا ایک ریاضی دان آریہ بھٹ تھا وہاں سے ہندوستانی اہل علم اسے ہارون الرشید کے قائم کردہ دارالحکمت

میں لائے، یہاں الخوارزمی نے علم ہندسہ میں اضافے کئے اور پھر یہاں سے یہ یورپ پہنچا جہاں اب بھی اسے عربیک نیومرل کہا جاتا ہے۔

آپ نے زبانوں کے رسم الخط کے بارے میں جو سوال کیا اس کے جواب میں قدیم تہذیبوں میں ہمیں یہ رسم الخط کئی شکلوں میں نظر آتا ہے جیسے چین کا رسم الخط، تصاویر اور آئیڈیاز پر مبنی تھا جسے جاپان اور ویت نام نے اپنی زبانوں کے لیے اختیار کیا۔ سمیریا کا رسم الخط خط میخی کہلاتا ہے۔ مصر کا ہیروغلامی، یورپ کو موجودہ رسم الخط دینے والے لبنان کے فونیقی تھے۔ جس کی بنیاد پر یونانی اور پھر لاطینی رسم الخط بنے اور اس رسم الخط کو یورپی زبانوں نے اختیار کیا۔ ہندوستان میں دیوناگری رسم الخط ہے۔ وادی سندھ کا رسم الخط چونکہ پڑھا نہیں گیا اس لیے اس کے بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا۔

یہاں میں ذکر کرنا چاہوں گا کہ دنیا بھر کی قدیم تہذیبوں میں رسم الخط کی ایجاد کانسی کے زمانے میں ہوئی۔

بلند اقبال:

ڈاکٹر صاحب اسلام سے پہلے ایران اور رومی سلطنتیں کن مراحل سے گزر رہی تھیں۔

مبارک علی

یونان کی شہری ریاستوں کا زوال اس وقت ہوا جب میسوڈینا کے بادشاہ فلپ نے حملہ کر کے یونان کو فتح کر لیا۔ فلپ کے مرنے کے بعد سکندر اس کا جانشین ہوا۔ سکندر ایک نوجوان اور پرعزم انسان تھا اس نے اپنی سلطنت کی وسعت کے لیے ایران پر حملہ کیا۔ وجہ تو اس کی یہ بتائی کہ چونکہ ایران نے چوتھی عیسوی قبل مسیح میں یونان پر حملہ کیا تھا اس لیے وہ اس کا انتقام لینا چاہتا تھا۔ اس وقت ایران کا بادشاہ واریوش (سوم) تھا۔ اس کو شکست ہوئی اور ایران پر اسکندر کا قبضہ ہوا۔ حسب معمول اس کی فوج نے لوٹ مار کی اور دارالحکومت ''پرسی

پورس'' کو جلایا۔ ایران کی فتح کے بعد اسکندر نے افغانستان اور ہندوستان پر حملے کئے۔ واپسی پر بابل میں اس کی وفات ہوئی۔ اس کے مرنے کے بعد اس کے جرنیلوں نے سلطنت کو باہمی تقسیم کر لیا۔ سلوکی کو ایران اور افغانستان ملا اور ٹولمی کو مصر۔ اس مرحلے پر آ کر یونان کے سیاسی تسلط کا خاتمہ ہوا۔ لیکن اس کا فلسفہ ضرور باقی رہ گیا۔

اس کے بعد ابھرنے والی سلطنت رومیوں کی تھی۔ پہلے یہاں کے حکمران (Etrusgan) تھے۔ رومیوں نے انہیں نکال کر ریپبلک قائم کی، جس کے اہم ادارے یہ تھے۔ سب سے پہلے Counsel ہوتا تھا۔ جس کو منتخب کیا جاتا تھا۔ پھر ''سینٹ'' کا ادارہ تھا جس کے اراکین قبیلوں کے اہم افراد ہوا کرتے تھے۔ تیسرا ادارہ اسمبلی کہلاتا تھا۔ اسمبلی کے اراکین عام لوگوں سے ہوا کرتے تھے۔ اسمبلی کو یہ حق تھا کہ وہ سینٹ کی کسی بھی قرارداد کو ویٹو کر دے۔ VETO کے معنی تھی ''میں نہیں مانتا'' حکومت کے دوسرے عہدے دار جن میں "JUDGES" "TRIBUE" ہوئے تھے جو سب کا انتخاب ہوا کرتا تھا۔ پلیبی سائٹ (PLEBCITE) سے عام لوگوں کی رائے لی جاتی تھی۔

رومیوں نے اپنے قوانین پتھروں پر کندہ کرا کے "FORUM" میں رکھوا دیئے تھے۔ فورم ایک کھلا چوک تھا۔ جہاں شہر کے لوگ آپس میں ملنے کے لیے آتے تھے۔ یہاں تماشے بھی ہوتے تھے۔ گیت بھی گائے جاتے تھے۔ کھیلوں کے مقابلے بھی منعقد کئے جاتے تھے۔ اور پلیٹ فارم تھا جہاں "Rostrum" رکھا جاتا تھا۔ یہاں سیاستدان اور دانش ور اور فوجی جرنیل لوگوں سے خطاب کرتے تھے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ رومیوں کے بنائے ہوئے قوانین اور سیاسی ادارے وراثت میں یورپ کو ملے۔

بلند اقبال:

ڈاکٹر صاحب آپ نے یونان اور روم کی تہذیبوں کا ذکر کیا اور یورپ میں جوان کے اثرات ہوئے وہ بھی تاریخ کا حصہ ہیں۔ اب میں یہاں تہذیبوں کی تاریخ سے زرا ہٹ کر مذاہب کے بارے میں آپ سے سوال کروں گا کہ اسلام سے پہلے کون کون سے

مذاہب تھے جنہوں نے ذہنی اور فکری تبدیلی کی؟

مبارک علی

چھٹی صدی قبل مسیح میں دنیا کی بڑی بڑی تہذیبوں میں جو مذاہب پیدا ہوئے ان کا میں ذکر کرنا چاہوں گا مثلاً یونان کی کالونی سلسلی میں فیثا غورث کے مذہبی خیالات نے ایک فرقے کو جنم دیا۔ فیثا غورث ریاضی دان بھی تھا اور فلسفی بھی۔ اس کا کہنا تھا کہ آسمان پر ستاروں کی گردش سے ایک روحانی موسیقی پیدا ہوتی ہے۔ لیکن اس موسیقی کو سننے کے لیے ریاضت کی ضرورت ہے۔ وہ انسان کے دوبارہ جنم لینے کا بھی قائل تھا اس کے فرقے کے ماننے والے مراقبے اور گہری سوچ کے ذریعے روحانی سکون کے متلاشی تھے۔

اس عہد میں ایران میں زرتشت نے اپنے مذہب کی تبلیغ کی۔ اس کے عقیدے کے مطابق نیکی اور بدی کے درمیان مسلسل تصادم ہے۔ کیونکہ یہ ہر شے کو پاک کر دیتی ہے یہ اپنے مردوں کو دفن نہیں کرتے بلکہ ٹاور کے چھت پر چھوڑ دیتے ہیں۔ جہاں وہ پرندوں کی غذا بن جاتا ہے۔ ان کے ہاں پُل صراط اور جنت و دوزخ کا تصور بھی ہے۔ چین میں کنفیوشس کا فلسفہ مقبول ہوا۔ لیکن یہ مذہب نہیں تھا اور نہ ہی اس میں دیوی دیوتاؤ کا کوئی تصور ہے۔ کنفیوشس سماج میں امن و امان برقرار رکھنے کے لیے درجہ بندی کا قائل ہے۔ مثلاً بادشاہ امراء اور عام لوگوں کو اپنے سماجی مرتبے کے مطابق رہنا چاہئے۔ وہ آباؤ اجداد کی پرستش کا بھی قائل تھا۔ تاکہ حال میں ماضی سے رشتہ جڑا رہنا چاہیے۔ کیونکہ کنفیوشن کا فلسفہ حکمرانوں کے لیے قابل قبول تھا اس لیے اس کی سرپرستی کی گئی۔

اسی زمانے میں ہندوستان میں گوتم بدھ نے خوش اور مسرت حاصل کرنے کا طریقہ کار یہ بنایا کہ انسان کو اپنی خواہشات کم سے کم کرنا چاہیے یہ نروان کا راستہ ہے۔ جین مذہب میں آہنسہ یا امن پر زور دیا گیا ہے۔ یہ کسی جاندار کو مارنے کے قائل نہیں اور ہر شے میں روح کو مانتے یہاں تک کے پتھر تک میں۔

اس عہد کے ان تمام مذاہب میں ان راستوں کو بتایا گیا ہے کہ جن پر چل کر

انسان دکھ اور تکلیف سے نجات پا کر مسرت اور سکون حاصل کر سکے۔ اس لیے حیرت کی بات یہ ہے کہ اگرچہ ان کے درمیان ہمیں کسی رابطے کا معلوم نہیں ہوتا ہے مگر ان سب میں انسان کو دنیاوی مصائب سے آزاد کرانے کا طریقہ بتایا گیا ہے۔

بلند اقبال:

اب ہم ایک بار پھر سیاست اور تاریخ کی جانب آتے ہیں۔ یہاں میں آپ سے سوال یہ کرنا چاہوں گا کہ رومی زوال کے بعد یورپ کیونکر اندھیرے میں ڈوب گیا؟

مبارک علی

جب رومی سلطنت ٹوٹی ہے تو اس کے نتیجے میں یورپ میں چھوٹی چھوٹی سلطنتوں کا ابھار ہوا۔ اس لیے یہ کہا جاتا ہے کہ یورپ میں فیوڈل ازم کا ادارہ طاقت ور ہوا۔ دوسری جانب کیونکہ رومی سلطنت اپنے آخری دور میں عیسائی ہوگئی تھی۔ اس لیے عیسائیت کا سب سے اہم ادارہ پاپ اپنی روحانی اور سیاسی طاقت کی وجہ سے پورے یورپ پر تسلط کا باعث بنا۔ چونکہ اس کا مرکزی شہر روم تھا اس لیے یہ شہر مذہبی حیثیت اختیار کر گیا۔ پوپ کا اثر و رسوخ اس وجہ سے تھا کہ گاؤں دیہات اور شہر تک چرچ کی عمارتیں تھیں اس کے عہدے دار پوپ کے وفادار ہوا کرتے تھے۔ مذہبی رسومات نے عیسائی عقیدے کو اور مضبوط کر دیا تھا۔ لوگ اولیاء کے مزارعات پر جاتے تھے ان کے تبرکات کی زیارت کرتے تھے اور مکمل طور پر عقیدے پر ایمان رکھتے تھے۔ لہٰذا اس معاشرے میں کسی بھی فرد کے لیے ناممکن تھا کہ وہ چرچ کی تعلیمات کی مخالفت کرے۔ تعلیم پر بھی چرچ کی اجارہ داری تھی۔

دوسری جانب قسطنطنیہ میں راسخ العقیدہ عیسائیوں کا غلبہ تھا یہاں رومی سلطنت کو بازنطینی کا نام دیا گیا تھا۔ مسلمانوں کا اولین مقابلہ اسی بازنطینی سلطنت سے ہوا جب انہوں نے شام اور مصر کو فتح کیا۔ بازنطینی سلطنت میں بھی مذہب کے غلبے کی وجہ سے فلسفے اور دیگر علوم کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ مغربی اور مشرقی عیسائیت

میں عقلی علوم پر پابندی تھی اور معاشرے میں مذہب کی ذراسی مخالفت بھی برداشت نہیں کی جاتی تھی۔

بلند اقبال:

ڈاکٹر صاحب آپ زرا یہ بتائیں کہ ساسانی اور بازنطینی رابطوں سے عربوں نے کیا سیکھا؟

مبارک علی

اسلام کی آمد سے قبل اس کی ہمسایہ دو بڑی سلطنتیں تھیں ایران میں ساسانی اور بازنطینی یہ دونوں تہذیب وتمدن کے اعتبار سے اپنے عروج پر تھیں۔ لیکن جب عرب اپنے صحراؤں سے نکلے اور فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا تو انہوں نے سب سے پہلے شام کا علاقہ فتح کیا جو بازنطینی تھا۔ اس کے بعد عراق پر قبضے کے بعد ساسانی سلطنت کو شکست دے کر اس پر عرب قابض ہوئے۔ چونکہ ایران کی تہذیب بہت پرانی تھی اس لیے عرب فاتحین نے اس تہذیب سے بہت کچھ سیکھا۔

عباسی دورِ خلافت میں جب ہارون الرشید نے دارالحکمت قائم کیا تو یہاں ہندوستانی، ایرانی، یہودی، عیسائی اور مسلمان علماء کو ملازم رکھا۔ عباسی دور میں یونانی فلسفے کا عربی میں ترجمہ ہوا۔ اسی یونانی فلسفے کا اثر تھا کہ مسلمانوں میں اسحاق کندی، فخرالدین دافر، فادابی، ابن سینا اور ابن رُشد جیسے فلسفی پیدا ہوئے۔ ان کا فلسفہ اور ان کی فکر اندلس کے راستے سے یورپ تک پہنچی جہاں ابن سینا اور ابن رُشد کی کتابیں یورپ کے تعلیمی نصاب کا حصہ بنیں۔ سائنس میں بھی جو مسلمانوں کا حصہ تھا اس سے یورپ فیضاب ہوا۔ یونانی فلسفے کا علم اہل یورپ کو عربی ترجموں سے ہوا اور پھر نشاۃِ ثانیہ کے زمانے میں لاطینی سے یہ تراجم یورپ کی مقامی زبانوں میں ہوئے۔ اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ یورپ کی ترقی میں مسلمانوں کے علم کا حصہ ہے۔

تاریخ میں یہ ہوتا رہا ہے کہ قومیں ایک دوسرے سے سیکھتی رہیں ہیں۔اس لیے مذہبی تعصب کی وجہ سے اگر دوسری قوموں کے علم کے حصول میں رکاوٹ ڈالی جائے تو اس صورت میں قومیں اندھیرے میں ڈوبی رہتی ہیں اور خود سے علم کی تخلیق نہیں کر پاتیں اس لیے اس پوری بحث میں ہم نے یہ دیکھا کہ یونان نے مصر سے سیکھا۔ روم نے یونان کے فلسفے کو اپنایا اور یہ رومی ورثہ یورپ میں منتقل ہوا۔ دوسری جانب عربوں نے نہ صرف یونانی فلسفے کو حاصل کیا بلکہ ہندوستان سے ریاضی اور ایران سے سیاسی افکار اور سیاسی سماجی روایات کو اختیار کیا۔ اس لیے کسی تہذیب کو یہ دعویٰ نہیں کرنا چاہیے کہ اس نے دوسروں سے دیکھے بغیر خود اپنی ذات سے سب کچھ تخلیق کیا اس لیے ہر دور میں ترقی یافتہ تہذیب آگے بڑھنے کے لیے راستہ دکھاتی ہے۔ قوموں میں جہالت اس وقت آتی ہے۔ جب وہ تاریخ میں قدیم تہذیبوں کا مطالعہ نہ کریں اور اپنی ہی دنیا میں رہتے ہوئے محدود علم و فضل سے فیض یاب ہونے کی کوشش کرتے رہیں۔

بلند اقبال:

ڈاکٹر صاحب آپ کے وقت اور تفصیل سے بات کرنے کا بہت بہت شکریہ آئندہ بھی آپ سے التماس کرتا رہوں گا اور آپ کے علم و تجربے سے اپنے ناظرین کو آگاہ کرتا رہوں گا۔

☆......☆......☆